مطائبا محمد علی

رئیس احمد جعفری

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

ادارۂ اشاعت اردو (حیدرآباد دکن)

مطائبات محمد علیؒ

پیشکش :۔ محمد احمد ترازی

از

رئیس احمد جعفری

ادارہ اشاعت اردو
حیدر آباد دکن
قیمت دو روپیہ چودہ آنہ سکہ عثمانیہ
قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ کلدار

طبع اول ——— ایک ہزار
ماہ اگست ۱۹۴۵ء

پروپرائٹر
سید عبد الرزاق

مطبوعہ
رزاقی مشین پریس
حیدر آباد دکن

مطائبات محمد علی

ہوں میں اک مینوائے گوشہ نشیں — ہوں میں اک دردمند سینہ فگار
شاد ہوتا ہوں اپنے جی میں کہ میں — "قوم" کا ہوں غلام کار گزار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — "خوش رقم" کوئی اور "نہ خوش گفتار"
بزم کا التزام گر کیجے — ہے زباں میری ابر گوہر بار
رزم کی داستان گر سنیے — کلک "جوہر" ہے تیغ جوہر دار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

(غالب بہ تصرف خفیف)

فہرس

محمد علی ۷
نگاہ اولین ۹

۱ طنزیات ۱۸
۲ چوٹیں ۲۸
۳ جرح ۳۶
۴ برہان قاطع و قاطع برہان ۴۰
۵ جواب لاجواب ۶۶

۶ حسن بیان ۷۶
۷ شوخیٔ گفتار ۹۵
۸ جدت تشبیہ ۱۰۹
۹ رعایت لفظی ۱۱۲
۱۰ بات میں بات ۱۳۰
۱۱ ظرافت ۱۴۱
۱۲ لطیفے ۱۵۷
۱۳ منظر و پس منظر ۱۷۰
۱۴ کھری کھری باتیں ۱۹۵
۱۵ حقائق ۲۱۰

رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ

محمد علی صرف ایک بلند پایہ اخبار نویس، ایک شعلہ مقال خطیب، ایک مسلّمہ انشاء پرداز اور صحافی ہی نہیں تھا، وہ بذلہ سنج اور نکتہ سنج بھی تھا، شوخی اُس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی، ظرافت اُس کے خمیر میں داخل تھی، طنزیات اور مطائبات کا وہ بادشاہ تھا۔

وہ مسرور ہو یا رنجور، مطمئن ہو یا پریشان، جیل کی کال کوٹھری میں ہو، یا احباب کی مجلسِ نشاط میں، مخدوم کے سامنے ہو یا خادم کے روبرو، کہیں بھی ہو، کسی رنگ میں بھی ہو، کیسی ہی کیفیت کیوں نہ اس پر طاری ہو، طنز و ظرافت، شوخی اور خوش طبعی بذلہ سنجی، اور حاضر جوابی، چٹکیاں اور گدگدیاں، اُس کی سرشت میں داخل تھیں، یہ ممکن نہیں تھا، محمد علی کہیں ہو، اور اپنی

موجودگی سے وہ ایک سماں نہ پیدا کردے، یہ اُس کی خصوصیت خاصہ تھی۔

محمد علی کے بکھرے ہوئے، منتشر اور پراگندہ ظرافت و مطائبات کو جمع کرنا، بہت بڑا کام ہے، ایسا ہی جیسے سمندر کی تہہ میں گھس کر موتیوں سے جھولی بھرنا، یہ کارِ اہم سیرۃ محمد علی کے مصنف، اور محمد علیات کے ماہر خصوصی جعفری صاحب نے بڑی خوبی، اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، انھوں نے ایک بالکل نیا اور اچھوتا موضوع تلاش کیا، اور اُسے بڑی خوبی، اور ستھرائی سے اتمام تک پہنچا دیا، یہ اردو لٹریچر کی بھی بڑی گراں بہا خدمت ہے، جس پر جعفری صاحب، ہر اردو دوست کے شکر و سپاس کے مستحق ہیں۔

(چودھری) محمد اقبال سلیم (گاہندری)

نگاہِ اولیں

محمد علی کے سے جامع خصوصیات و جامع حیثیات انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کی وفات پر دنیا کے ایک مشہور مفکر اور انگریزی زبان کے ایک مایہ ناز انشاء پرداز ایچ، جی، ویلز نے کہا تھا "محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی، اس کا قلم، میکالے کا قلم تھا"! — یہ غلط نہیں تھا، لیکن اگر ہم اس مفہوم کو زیادہ صنعت کے ساتھ ادا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں، میکالے کے قلم میں وہ زور تھا، جو محمد علی کے زورِ قلم سے مشابہ تھا۔ برک کی زبان میں وہ خطابت تھی، جو محمد علی کے زورِ بیان سے ملتی جلتی تھی۔ نپولین کے سینہ میں وہ دل تھا، جو محمد علی کے قلبِ آہنیں سے مشابہت رکھتا تھا، اور جو کچھ ان سب میں تھا، وہ، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ایک اکیلے محمد علی کی ذات میں موجود تھا۔ ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

محمد علی کی شخصیت، کس بلا کی شخصیت تھی۔ وہ کتنی بے پناہ ہستی کا مالک تھا؛ جس میدان میں اس نے قدم رکھا، سب سے آگے نکل گیا، جس راستہ پر رہبری کی رہنا بن گیا، جس علم اور فن کی طرف توجہ کی اس کا ماہر نظر آنے لگا۔

وہ کسی عربی مدرسہ کا سند یافتہ نہیں تھا، صرف و نحو، ادب و لغت حدیث و تفسیر، فقہ و کلام، ان میں سے کسی فن کا اس نے درس نہیں حاصل کیا تھا، لیکن اس کی تحریروں میں، ان سب فنوں کی چاشنی ملے گی۔

وہ نہ کسی یونیورسٹی کا ایل۔ ایل۔ بی تھا، نہ لندن کا بیرسٹر۔ نہ اس نے ہائی کورٹ میں پریکٹس کی تھی، نہ "لوئر" کورٹ میں۔ نہ وہ مجسٹریٹ کی کرسی پر متمکن ہوا تھا نہ قضا کی مسند پر۔ لیکن جب وہ قانون کی گتھیاں سلجھاتا تھا، آئین کے عقدے حل کرتا تھا، دستور کے نکتے واشگاف کرتا تھا، تو حریف اور حلیف دنگ رہ جاتے تھے، وکیل اور بیرسٹر، ع

انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے بروں

نظر آتے تھے، اس نے ہائی کورٹ میں اپنی ضبطیٔ ضمانت کے خلاف، خود پیروی کی، محمد علی کی بحث سننے کے لئے ایک ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا، بحث کے خاتمہ پر بڑے بڑے پیشہ ور وکیلوں اور بیرسٹروں نے محمد علی سے کہا "محمد علی، کاش تم وکیل ہوتے!"

وہ واعظ نہیں تھا، خطیب نہیں تھا، ناصح نہیں تھا، لیکن بزم و انجمن میں اس کا چرچا تھا، اس کی تقریر لوگوں کے دلوں کی آنکھیں کھول دیتی تھی، اس کی اثر آفرینی، سنگ دلوں میں گداز پیدا کردیتی تھی، اس کا

خلوص سرکشوں اور باغیوں کو مطیع و منقاد بنالیتا تھا، واعظان شیریں مقال کے پند و موعظت میں وہ اثر نہیں تھا، جو محمد علی کی "گلوگیر" آواز میں تھا طلاقت لسان اور فصاحت بیان کے جوہر دکھانے والے خطیبوں میں وہ کشش اور جاذبیت نہیں تھی، جو محمد علی کے چند سادہ اور صاف جملوں میں نظر آتی تھی، نصیحت گروں، اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی دعوت دینے والوں میں وہ سوز، وہ گداز، وہ رقت نہیں تھی، جو محمد علی کی زبان میں تھی، وہ جب روتا تھا، تو مجمع کی آنکھیں بھی پُرنم ہوجاتی تھیں، وہ ہنستا تھا، تو مجمع بھی باغ و بہار بن جاتا تھا، وہ جب جذبہ کے عالم میں ہوتا تھا تو مجمع بھی سراپا جوش و کردار بن جاتا تھا، وہ جب چلتا تھا تو مجمع میں بھی صبا رفتاری پیدا ہوجاتی تھی، وہ جب رُکتا تھا تو مجمع بھی خستہ اور پا لنگ نظر آتا تھا، وہ عامل تھا اور مجمع معمول۔ وہ حاکم تھا اور مجمع محکوم۔ وہ دل کی مملکت کا بادشاہ تھا اور دل اس کا زیر نگیں۔ وہ عصائے موسیٰ بھی تھا اور اعجاز مسیحا بھی۔ وہ جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ وہ جوش بھی تھا اور فکر بھی۔ وہ دل بھی تھا اور دماغ بھی۔ وہ مجاہد بھی تھا اور شاعر بھی۔ وہ سب کچھ تھا، وہ اس جہان سے رخصت ہوا تو کچھ نہ رہ گیا۔

وہ اس ملت کا امیر اور رہنما تھا، جو سیدھے رستے سے دُور تھی، وہ ملت غبار راہ کی طرح ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھی، سنگ راہ کی طرح ٹھوکروں سے پامال ہو رہی تھی، محمد علی گرجتا ہوا، برستا ہوا، للکارتا ہوا میدان میں آیا، اور اس کے آتے ہی وہ غبارِ راہ طوفان بن گیا! وہ طوفان جس نے

استعمار کی دیواروں میں تزلزل برپا کر دیا، جس نے سامراج کے نظام کو زیر و زبر کر دیا، جس نے استبداد کو لرزہ براندام کر دیا، جس نے شہنشاہیت، قیصریت، آمریت، اور مطلق العنانیت کے کنگرہ ہائے فلک بوس کو سرنگوں کر دیا! اس لئے میدان عمل میں نزول اجلال فرماتے ہی، سنگ راہ کو سنگ خارا بنا دیا۔ وہ چٹان بنا دیا جس سے سمندر کی لہریں ٹکراتی ہیں، اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جاتی ہیں، جس پر طوفانوں کے قافلے گزرتے ہیں، اور گزرتے چلے جاتے ہیں مگر اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، جو حوادث دہر اور مرور ایام کا مقابلہ کرتی ہے، کیا یہ محمد علی کا اعجاز نہیں تھا، جس کا نام محمدؐ اور علیؑ سے مرکب ہو، ضرور تھا کہ اس میں، اس کے وجود میں، اس کی ہستی میں چراغ مصطفویؐ کی ضیا گستری، اور عزم حیدریؑ کی جھلک نظر آئے، اگر وہ صاحب اعجاز نہ ہو تو اور کون ہو سکتا ہے؟ اس نے اپنی ملت کو بنایا، لیکن خود تباہ ہو گیا، اس نے چمن ملت کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی، اور خود مضمحل ہوتا چلا گیا، اس نے دل اور روح کی پوری قوت سے قوم میں بیداری کی لہر پیدا کی، لیکن ہر ہر نعرہ پر اس کا دل کمزور اور اس کی روح کمزور تر ہوتی چلی گئی، اس نے مُردوں کو زندہ کر دیا، لیکن خود فنا کے آغوش میں پہنچ گیا، جہاز کا ناخدا اپنے وجود کو خطرہ میں ڈال کر بھی مسافروں کی جان بچا لیتا ہے، فوج کا سپہ سالار گولیوں کی بوچھار میں کھڑا رہ کر بھی فوج کو نکال لے جاتا ہے، قوم کا سردار آماجگاہ آفات و ہجوم ہونے کے باوجود قوم کو نہیں مرنے دیتا، محمد علی نے یہی کیا، اور یہی اس کے شایان شان تھا۔

محمد علی کی ساری زندگی، میدان جہاد میں گزری، جہاد صرف کافروں، اور مشرکوں سے نہیں، لے دینوں، اور ملحدوں سے نہیں، ملت کے دشمنوں، اور قوم کے غداروں سے نہیں، بلکہ دوستوں اور ساتھیوں سے بھی، نیازمندوں اور جاں نثاروں سے بھی، مداحوں اور خیرخواہوں سے بھی، عزیزوں اور عزیز ترین دوستوں سے بھی، رفیقان راہ اور شرکاء منزل سے بھی، یہ اسی کا کلیجہ تھا کہ جب تک زندہ رہا، میدان جنگ میں ڈٹا رہا، ان معرکوں سے اگر نپولین کو سابقہ پڑا ہوتا تو اس کا دل پھٹ جاتا، ان حالات میں اگر برک کو بولنا پڑتا تو اس کی زبان گنگ ہو جاتی، اس ماحول میں اگر میکالے کو انشاء پردازی کے جوہر دکھانا پڑتے تو وہ قلم کو پھینک دیتا!

ملت کو سمجھانے والا ایک تھا، بہکانے والے بہت تھے، صراط مستقیم کی دعوت دینے والا تنہا تھا، اور مشرق کی طرف منہ کر کے مغرب کا عزم سفر کرنے والوں کی رہنمائی کو انبوہ کا انبوہ موجود تھا، یہ وجہ تھی کہ محمد علی کو مختلف روپ بھرنے پڑے، کبھی وہ مطرب بنا کبھی ندیم۔ کبھی حکیم بنا کبھی مصلح۔ کبھی خطیب بنا کبھی انشاء پرداز۔ کبھی مدبر بنا کبھی مفکر۔ کبھی واعظ بنا کبھی ناصح۔ کبھی دوست بنا کبھی دشمن۔ وہ نہ کسی کا دوست تھا نہ دشمن۔ نہ ناصح تھا نہ واعظ۔ نہ مفکر نہ مدبر۔ نہ انشاء پرداز نہ خطیب۔ نہ مصلح نہ حکیم۔ نہ ندیم نہ مطرب۔ وہ قوم کا چاکر تھا، اور قوم کے لئے وہ سب کچھ بن سکتا تھا۔ سب کچھ بنا۔

جن حالات میں محمد علی کو زندگی گزارنا پڑی، اگر کوئی اور ہوتا تو دیوانہ

ہو جاتا، دیوانہ نہ ہوتا تو کم از کم آپے میں نہ رہتا۔ آپے میں رہتا تو اس پر، نامرادی، اور ناکامی کے سبب، یاس کا رنگ اس درجہ غالب آجاتا کہ وہ "عبوسا قمطریرا" بن کر رہ جاتا۔ لیکن محمد علی کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ روتا تھا، اور رُلاتا تھا، لیکن رونے اور رُلانے کے دوران میں ہنستا تھا اور ہنساتا تھا، وہ وار کرتا تھا اور وار سہتا تھا، لیکن جنگ کی اس گھما گھمی میں بھی اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے! اس کا قلم تیغ آب دار کی طرح، مخالف، اور مخالفت کے سر، دل، اور جگر کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹتا چلا جاتا تھا، لیکن عین اسی حالت میں اس کی برجستہ گوئی، اس کی ظرافت، اس کی بذلہ سنجی، خود بسمل سے بھی داد حاصل کر لیتی تھی، اس کی آنکھ سے انگارے برستے ہوتے تھے، اس کی زبان سے شعلے نکلتے ہوتے تھے، اس کے قلم سے چنگاریاں اُبل رہی ہوتی تھیں۔ لیکن ان انگاروں، ان شعلوں، اور ان چنگاریوں کو، جب وہ چاہتا تھا، گلزار بنا دیا کرتا تھا، وہی لوگ جو اس کی آتش غضب میں نار جہنم کی تکلیف محسوس کرتے تھے، اس کی باغ و بہار، اور گل و گلزار باتیں سن کر ایک ایسے چمن میں پہونچ جاتے تھے، جہاں پھولوں کی نکہت بیزی، باد صبا کی اٹکھیلیاں اور کیف و سرور کا سامان، جہنم کو بھی فخر بوستان اور رشک جنان بنا دیتا تھا، اس کے قلم اور زبان کا بھڑکتا ہوا دوزخ آن کی آن میں دامان باغبان و کف گل فروش بن جاتا تھا!

محمد علی کی ذات آتش فشاں پہاڑ بھی تھی، اور باغ ارم بھی۔

آتش فشاں پہاڑ جب لاوا اگلتا ہے، تو ہری بھری کھیتیاں،

لہلہاتے ہوئے باغ، سرسبز وادیاں، ویران ہو جاتی ہیں، زندگی موت کی ہچکیاں لینے لگتی ہے، بہار خزاں سے بدل جاتی ہے۔

باغ ارم میں آگ کا کیا کام؟ وہاں کی گلفروش وادیاں، وہاں کی عنبر بیز ہوائیں، مشام جان کو معطر کرنے والی وہ خوشبوؤں کی لپٹ، دل و دماغ پر بالیدگی کی کیفیت طاری کر دینے والے وہ طیور کے نغمے، رُوح اور احساس میں نمو، اور زندگی پیدا کرنے والے مناظر، کہیں جہنم کا تصور کرنے کی مہلت بھی دے سکتے ہیں؟

یہی حال محمد علی کا تھا، وہ جب کوہ آتش فشاں نظر آتا تھا، تو حریف اور حلیف، دوست اور دشمن، مخالف اور مداح، سب دہل جاتے تھے۔ وہ جب باغ ارم بنتا تھا، تو سب پر سکر اور وجد کا عالم طاری ہوتا تھا، دل کی کلی کھل جاتی تھی، پھول بنتی تھی، اور پھر گلزار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا!

اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ محمد علی کی ان چیزوں کو پیش کیا جائے جو اپنی شوخی، اپنے انداز بیان، اپنے لطف، اور کیف کے اعتبار سے زبان و ادب میں ایک خاص اہمیت اور منزلت کی حامل ہیں۔

محمد علی کی تحریروں اور تقریروں سے ایسی چیزوں کا انتخاب کرنا آسان نہیں تھا، وہ بڑے زبردست "لکھاڑ" تھے، لکھنے پر آتے تھے تو صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے تھے، چونکہ دردِ دل سے مجبور ہو کر لکھتے تھے، اس لئے حدود میں مقید اور پابند نہیں رہ سکتے تھے، ؎

"بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل"

کچھ اور چاہیے، وسعت میرے بیاں کیلئے

فرض کیجئے، انہوں نے "خلافت کانفرنس" پر قلم اٹھایا، اس مضمون میں آپ کو تفسیر کے نکتے بھی مل جائیں گے، اور اقتصادیات کے مسائل بھی۔ خواجہ حسن نظامی بھی اور مولانا ظفر علی خاں بھی۔ کانگریس بھی اور مسلم لیگ بھی۔ جواہر لال بھی اور ڈاکٹر مونجے بھی۔ خود نوشت سوانح حیات بھی، اور وائسرائے کی کسی تقریر پر تبصرہ بھی۔ سلطان ابن سعود بھی، اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی پڑھنے والا گھبراتا ہے، تو گھبرائے، لیکن وہ اپنے دل کی ہر آواز، قلم کے ذریعہ کاغذ کے صفحہ پر، یا زبان کے ذریعہ، حاضرین کے دل میں اتار کر رہیں گے۔

ایسے مضامین میں سے "مطالبات" کا تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، بلا مبالغہ، انہوں نے سیکڑوں صفحے اور ہزاروں کالم لکھ ڈالے ان گنت تقریریں کر ڈالیں، لاتعداد بیانات دے ڈالے، اس کتاب کے مرتب نے ان کا ایک ایک حرف پڑھا، چھانا، اور ایک مجموعہ تیار کر لیا، یہ وہ سونا ہے، جو ریت کے سمندر سے نکالا گیا ہے، یہ وہ موتی ہیں جو بحر طوفاں خیز کی تہ تک غوطہ لگا لگا کر برآمد کئے گئے ہیں، یہ وہ پھول ہیں جو کانٹوں میں سے چنے گئے ہیں، یہ وہ گلدستہ ہے جس میں کچھ کانٹے اب بھی ہیں، اور نوک سوزن کا کام دیتے ہیں ے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

کہیں کہیں محمد علی کے پھول بھی کانٹے بن جاتے ہیں، لیکن یہ باغ

ادب پر ظلم ہوتا اگر ان کانٹوں کے بغیر گلدستہ تیار کر لیا جاتا، پھر وہ گلدستہ نہ ہوتا، اگر ان کانٹوں کے بغیر گلدستہ تیار کر لیا جاتا، پھر وہ گلدستہ نہ ہوتا، چند بکھرے ہوئے پھولوں کا مجموعہ ہوتا، عجیب مصیبت ہے، جس طرح محمد علی کے پھول کبھی کبھی کانٹے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح ان کے کانٹے، پھول بن جاتے ہیں، اگر ہمیں گلدستہ بنانا ہے، تو کانٹا ملا پھول ہو یا پھول کانٹا ہو ہمیں دونوں کو لینا پڑے گا، لیکن احتیاط کے ساتھ۔

اس کتاب کا مرتب صلہ کا طالب نہیں ہے، ہاں داد ضرور چاہتا ہے، تلاش و جستجو، اور سراغ و تفحص کی داد! اور اگر آپ اس میں بھی کچھ متامل ہوں تو بقول حسرت، ے

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں!

اب نقاب اٹھایئے، اور عروس ادب کا نظارہ کیجئے۔

رئیس احمد جعفری

باب (۱)

طنزیات

محمد علی طنزیات کے ماہر تھے، دوست ہو یا دشمن، ان کے خدنگ طنز سے کوئی نہیں بچا تھا، ان کا طنز کبھی طنز لطیف ہوتا تھا، اور کبھی جارحانہ! لیکن دونوں حالتوں میں، اس پر لطف کا عنصر غالب رہتا تھا، وہ کبھی کڑوی گولیوں پر طنز کی شکر لپیٹتے تھے، اور کبھی شکر کو طنز کی کڑوی گولیوں میں چھپا دیتے تھے، جو طنز کے لذت آشنا ہیں، وہ دونوں صورتوں میں اس سے لطف لے سکتے ہیں۔

لگی لپٹی رکھنے، اور رد، رعایت کرنے کی محمد علی میں عادت نہیں تھی، وہ تو مرد قلندر تھے، ع

جو دل میں وہ زباں پر اللہ جانتا ہے

جو دل میں آجائے، وہ زباں پر نہ آئے؛ یہ ممکن ہی نہیں تھا،

جواہرلال نے اپنی آپ بیتی میں سچ لکھا ہے، کہ محمد علی کے فکاہی اور طنزی جنون نے بہت سے دوستوں کو دشمن بنا لیا، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انہیں اس دُنیا سے رخصت ہوئے، بارہ چودہ برس کی مدت گزر چکی ہے، لیکن بعض دل اب بھی ایسے ہیں، جو ان سے صاف نہیں ہیں۔

بہرحال ان کا طنز ہوتا بے محابا تھا، کم از کم غیر متعلق پڑھنے والے تو ان کے طنز سے ادبی لطف ہی لیں گے۔

اذان اور امامت!

انگریز شریف مکہ کے حامی تھے، اور چاہتے تھے، حجاز پر اسی کا تسلط اور اقتدار رہے، چنانچہ شریف کی حمایت میں جو پروپگنڈا ہوتا تھا اس میں اس بات پر بہت زور دیا جاتا تھا کہ شریف، سید ہے، قریشی ہے، اور امامت قریشی ہی کا حق ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں، مؤذن رسولؐ، حضرت بلالؓ کے وطن کی طرف استعمار فرنگ کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔

۳ر دسمبر ۲۵ء کو "مصر و سوڈان" کے مسئلہ پر دہلی میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا۔

"انگریز حدیث نبوی کا یہ ٹکڑہ تو سیکھ گئے ہیں کہ امامت قریش میں ہے، لیکن اسے بھول گئے کہ اذان حبشہ میں ہے!"

یہ یاد دہانی، طنز لطیف کی کتنی بہترین مثال ہے!

ایک سوال — ؟

۱۹۲۵ء میں، جب شریف اور سلطان ابن سعود میں لڑائی ہو رہی تھی، حکومت یہ چاہتی تھی، کہ مسلمان اس سال حج نہ کریں، اس تحریک میں غرض یہ پوشیدہ تھی کہ اگر ہندوستان سے حاجی نہ جائیں گے تو حجاز کی حکومت کو مالی صدمہ پہنچے گا، اور اس کی بنیاد کمزور ہو جائے گی، سر حبیب اللہ اس زمانہ میں حکومت ہند کے رکن تھے، اور یہ شعبہ انہی کے ماتحت تھا، وہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

محمد علی اس کے شدید مخالف تھے، وہ چاہتے تھے، مسلمان حج ضرور کریں، حکومت حسب سابق جہازوں کا انتظام کرے، اس سلسلہ میں محمد علی نے لکھا:-

"سر حبیب اللہ کی بیش قرار تنخواہ، ان کے خطابات، ان کی پندرہ ضرب توپ کی سلامی، یہ ان کو مبارک ہوں، مگر ان سب دنیاوی سعادتوں کے علاوہ اگر وہ محبت اسلام کا ادعا بھی فرمائیں گے، تو ضرور ہر مسلمان سوال کرے گا کہ آپ کے اسلام نے تو آپ کو یہ سب کچھ دلوایا مگر آپ بتائیے کہ آپ نے اسلام کو کیا دلوایا؟"

گویا سر حبیب اللہ محض "مسلمان" ہونے کے سبب خطاب

و دولت سے سرفراز ہوئے، اور انہوں نے اس کا صلہ کیا دیا "امتناع حج"؟

اہل بیت

حجاز میں لڑائی جاری ہے، سلطان ابن سعود کی طرف سے حاجیوں کو اطمینان دلایا جا چکا ہے کہ وہ شوق سے آئیں، ہم ان کا ذمہ لیتے ہیں مگر سر حبیب اللہ ابھی تک متامل ہیں، اس سلسلہ میں وہ ایک بے تکا بیان بھی شائع کرتے ہیں۔

محمد علی نے کہا:-

"سر حبیب اللہ معاف فرمائیں، یہ سب کام نہ کرنے کے بہانے ہیں، اگر آج وہ اپنے اس بیان کے متعلق خود اپنے متعلقین سے رائے لیں گے، تو کوئی ان کی معذرت کا سراہنے والا انہیں اپنے "اہل بیت" میں سے بھی شاید نہ ملے!"

"اہل بیت" کی تلمیح کتنی معنی خیز ہے؟

ڈھول کا پول

اسی زمانہ میں حکومت کی طرف سے یہ پروپیگنڈا ابھی جاری تھا کہ ہم کسی کے مذہب میں مداخلت تھوڑے ہی کرنا چاہتے ہیں، ۱۳ مئی ۱۹۲۵ء کو دہلی کی جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے اس کا جواب دیا:-

" آپ کے دشمن ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ کے مذہب میں

مداخلت ان کو منظور نہیں، آپ چاہے ایک خدا کو مانیں، چاہے تین خداؤں کو مانیں، مگر کہنا ہر حالت میں ان کا مانیں۔

ایام جنگ میں کسی نے آپ کی نماز نہیں بند کی، لیکن حکم یہ تھا کہ اپنی مساجد میں خدا سے دعا یہی مانگو کہ خدا کے آخری رسول کے جانشین اور خلیفہ اور لشکر اسلام کو شکست ہو، اور فتح ان کے دشمنوں، اور دشمنان اسلام کو نصیب ہو، جب تک آپ بوکھلائے ہوئے حج کو جاتے تھے، ان کو آپ کے حج سے سروکار نہ تھا، مگر آپ میں سے چند نے، بعد از خرابیٔ بصرہ، بلکہ یوں کہئے کہ "بعد از خرابیٔ مکہ" یہ سمجھا کہ حج بیت اللہ ایک موتمر اسلامی ہے اور وہاں مسلمانان عالم کے سود و بہبود پر غور کرنا چاہئے تو انہیں فکر پیدا ہو گیا۔!"

"خرابیٔ بصرہ" کے جواب میں "خرابیٔ مکہ" کتنا بلیغ اشارہ ہے؟

"صورت حالات"

بڑی سے بڑی غلطی "صورت حالات" کے ماتحت روا سمجھ لی جاتی ہے "صورت حالات کا تقاضا یہ تھا!" "صورت حال یہی تھی" ایسی صورت حالات میں اس کے سوا چارہ نہ تھا!" ہم اکثر سنتے رہتے ہیں۔

محمد علی نے "صورت حالات" کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ ملاحظہ ہو:۔

"صورت حالات کا عذر ایک بہت ہی اچھا بھینٹ کا بکرا ہے، جو تمام گناہوں کا کفارہ ہو جایا کرتا ہے، یہ جملہ دراصل ہماری کمزوریوں کا ایک خوش نما طرز بیان ہے!"

"صورت حالات" کی اس سے بہتر وضاحت، اس سے زیادہ اور "خوش نما طرز بیان" میں ممکن ہے؟

ایمان دار معترضین

ایک جماعت "ایمان دار معترضین" کی ہماری قومیات میں عرصہ سے دخیل ہے، محمد علی کے زمانہ میں تو یہ جماعت کہنا چاہئے شباب پر تھی، اور شباب بھی کیسا؟ قیامت کا!

اب محمد علی کی زبان سے کچھ سنئے:۔

"ایمان دار معترضین وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو دھوکا دینے، اور اپنی قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ پر ہمارا بھی ایمان ہے، مگر بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں، جو بھلی نیت کے باوجود بھلے نہیں ہو سکتے، قتل انسان اور زنا بالجبر خواہ اچھی نیت سے کئے جائیں یا بری نیت سے، بہرحال قتل انسان اور زنا

باالجبر ہی رہیں گے !"

مطلب یہ کہ خواہ کتنی ہی "ایمان داری" سے ان کا ارتکاب کیوں نہ کیا گیا ہو !

تماشا اور تماشائی

جنوری ۱۹۲۷ء میں، مرکزی اسمبلی کی نئی عمارت کا افتتاح نئی دہلی میں وائسرائے بہادر کے ہاتھوں ہوا، اس موقع پر تارک موالات ہونے کے باوجود محمد علی بھی یہ تماشا دیکھنے گئے، اب تماشائی کی رپورٹ سُنئے :-

"۳۲ کروڑ خدا کی مخلوق، مٹھی بھر اجنبیوں کی غلامی میں مبتلا ہے، جو سات ہزار میل کے فاصلے سے، سات سمندر پار آکر اس پر حکومت کرتے ہیں، عجوبۂ روزگار یہ چیز ہے ؛ اگر پانچ براعظموں کے تماشائی دُور دراز مقامات سے آکر تاج بی بی کا روضہ، اور دلّی کے لال قلعہ یا قطب مینار کی جگہ اس (منظر) کا تماشا کریں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے ؟
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ؟
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی،
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اسی دانہ کو، اسی کھیتی کو، اسی باراں کو، اسی راہ کو، راہرو کو رہبر کو، منزل کو، اسی ناخدا کو، اسی بحر کو، کشتی کو، ساحل کو اسی قیس کو، لیلیٰ کو، صحرا کو، محمل کو، اسی مے کو، مینا کو، ساقی کو، محفل کو، آوارہ عناں تاب، رائے سینا (نئی دہلی) کی سڑکوں پر دیکھا کہ داخلے کے ٹکٹ ہاتھ میں لئے ہوئے جا رہی ہے، گویا وہ بھی کسی تاریخی خاندان کا شجرہ، یا جنت کے لئے پروانۂ راہ داری ہے !"

اس زورِ بیان میں طنز کی جو بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اُنہیں کون نہیں دیکھ رہا ہے - ؟

فریبِ عدل

مرکزی اسمبلی کی نئی عمارت کے افتتاح کے سلسلہ میں آگے چل کر محمد علی لکھتے ہیں :-

"لاٹ صاحب (وائسرائے) نے دعا فرمائی کہ خدا اس عمارت میں کام کرنے والوں کو عقل و عدل کی توفیق دے، ہم سوا آمین کے کیا کہہ سکتے ہیں؛ خدایا اگر ان کو عدل نہیں دیتا تو ہمیں عقل دے کہ اس فریب عدل سے نجات پائیں!"

کتنا اچھوتا، لیکن کتنا دل دوز طنز ہے؟

"سلسلۂ حکمرانانِ ہند"

تاریخ کی کتابوں میں "سلسلۂ حکمرانانِ ہند" آپ نے اکثر ملاحظہ فرمایا ہوگا، محمد علی جب اس جملہ کو استعمال کرتے ہیں، تو ان کے پیشِ نظر تغلق، خلجی، غوری، لودی، مغل، سلسلہ نہیں ہوتا، بلکہ اس لفظ سے وہ ایک اور مخلوق مراد لیتے ہیں، فرماتے ہیں:-

"ہندوستان کے حکمران نہ ملک معظم جارج پنجم ہیں، نہ وزارت برطانیہ، نہ وائسرائے، نہ ہندوستان کی قانون ساز جماعتیں، بلکہ وہ سلسلۂ حکمرانانِ ہند جس کا نام "انڈین سول سروس" ہے۔"

کتنا دلچسپ ہے یہ نیا "سلسلۂ حکمرانانِ ہند"؟

مقدمہ لڑنے کی خوشی

میر محفوظ علی بدایونی کے نام نامی سے ہر ادب دوست واقف ہے، میر صاحب اور محمد علی میں بڑے گہرے روابط تھے، محمد علی کی خواہش تھی، میر صاحب آئیں، اور "ہمدرد" کو سنبھالیں، میر صاحب، مقدمہ بازی میں پھنسے ہوئے تھے، اس لئے بار بار معذرت چاہتے تھے، محمد علی نے جل کر لکھا:-

"اصل بات یہ ہے کہ آپ کو مقدمہ بازی سے خاص محبت ہوگئی ہے، ورنہ "ہمدرد" کی اہمیت کے سامنے انصاف کیجئے، وہ ہیں ہی کیا؟ واللہ کہئے تو ان سب کی رقم جو کلہم اجمعین ایک ہزار ہوتی ہے، نیاز مند گرہ سے ادا کردے اور آپ کو گھر بیٹھے جتا دے، لیکن اس طرح آپ کو مقدمہ لڑنے کی خوشی نہیں حاصل ہوگی!"

باب (۲)

چوٹیں

اپنی تحریر و تقریر میں، اصل موضوع پر اظہار خیال کرتے کرتے محمد علی حریف پر چوٹیں بھی کرتے تھے، ایسی چوٹیں بھی جو دل میں گدگدی پیدا کر دیں اور ایسی چوٹیں بھی جو دل کو دو نیم کر دیں، خوش مذاقی اور خوش طبعی کا وہ ایک بحر ناپیدا کنار تھا، جس کی موجیں کبھی اتنی ہلکی ہوتی تھیں کہ ساحل تک نہیں پہنچ پاتی تھیں، اور کبھی اتنی اونچی اور بڑی کہ ساحل تو ساحل، ورائے ساحل تک پہنچ جاتی تھیں، اور خشک دامنوں کو تر دامن بنا دیتی تھیں۔

ہر حالت میں محمد علی کے منہ سے نکلے ہوئے بول، خواہ وہ فضا میں گونج رہے ہوں، یا اخبار کے کاغذ پر نمایاں ہوں، ایک میٹھی کھٹک اور کسک بھی رکھتے تھے۔

امیر البحر نلسن

وہی امتناع حج کا مسئلہ در پیش ہے، سلطان کی طرف سے حجاج کی

حفاظت کا وعدہ کیا جا رہا ہے، گو سر حبیب اللہ فرماتے ہیں، ہمیں کوئی سرکاری اطلاع نہیں، ہم اس بیان کو کیسے صحیح سمجھ لیں،

محمد علی نے فرمایا:-

"سر حبیب اللہ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے، کہ "ہمیں کوئی سرکاری اطلاع نہیں ملی، صرف محمد شفیع (داؤدی) ہی کہتے ہیں کہ ابن سعود نے تین بندرگاہوں پر اترنے والے حاجیوں کی ذمہ داری لی ہے"۔ موصوف سے کوئی پوچھے کہ حضرت امیر البحر نلسن کی طرح پھوٹی ہوئی آنکھ پر دوربین لگائیے گا تو سوا اس کے کیا ہوگا کہ کچھ نہ سوجھے!

("ہمدرد"، ۳۰۔ اپریل ۱۹۲۵ء)

خود سر حبیب اللہ کی آنکھوں پر بھی ہمیشہ "دوربینی" کے لئے عینک چڑھی رہتی تھی، یہی دیکھ کر محمد علی کا ذہن نلسن کی دوربین کی طرف منتقل ہو گیا۔

پردہ کانفرنس

آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں، ایک دور وہ بھی تھا، جب محمد علی سلطان کے وعدوں پر بھروسہ کر کے مخالفت اور ہنگامہ کے ہجوم میں سلطان کی حمایت کر رہے تھے، اور ان کے رفیقوں اور دوستوں کی ایک بڑی جماعت، ان کی مخالفت کر رہی تھی۔

اس زمانہ میں انجمن "خدام الحرمین" کا ایک اجلاس لکھنؤ کے

رفاہ عام میں، مولانا حسرت موہانی کی زیر صدارت منعقد ہوا، اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے، جو سلطان ابن سعود کے مخالف ہوں، اس کے برعکس محمد علی کے جلسے، جو سلطان کی حمایت میں منعقد ہوتے تھے، عام ہوتے تھے، ان میں موافقین اور مخالفین دونوں کو شرکت کی اجازت تھی، ہر شخص اختلاف یا اتفاق کا اظہار کر سکتا تھا۔

خدام الحرمین کے جلسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا، اور قناتیں کھینچ کر اسے چشم مردم سے نہاں کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔

اس کانفرنس پر محمد علی نے ایک مقالۂ افتتاحیہ "ہمدرد" میں لکھا، اور اس کا عنوان رکھا "پردہ کانفرنس"۔

یہ دو لفظ کتنے وسیع معنی اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں!

سر ضیاء الدین

آغاز ہی سے محمد علی کی مخالفت اس گروہ سے شروع ہو گئی، جس کے ایک فرد ڈاکٹر ضیاء الدین بھی تھے۔

محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیاں صرف مسلم یونیورسٹی اور اس کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے پر صرف ہونا چاہئیں، لیکن ڈاکٹر صاحب ان امور کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی پورا حصہ لیتے تھے، محمد علی کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔

چنانچہ انہوں نے سہارن پور کے ایک اجتماع کا ذکر کرتے ہوئے یکم دسمبر ۲۶ء کو اپنے مضمون میں لکھا:-

"ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نام نہاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعلیم کے سوا ہر چیز سے دلچسپی لیتے ہیں۔"

جسکی تصدیق بعد میں "رحمت اللہ کمیٹی" سے بھی ہو گئی۔

من و دل

سلطان ابن سعود نے، جب ان تمام مواعید کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جو انہوں نے علی برادران اور جمعیت خلافت سے کئے تھے، دفعتہً اعلان ملوکیت کر دیا اور حجاز کے فرماں روا بن بیٹھے، تو وہی محمد علی جو ان کی حمایت میں گالیاں کھا رہا تھا، اب ان کا سخت و شدید مخالف بن گیا، جو لوگ گالیاں دے رہے تھے، وہ پھول نچھاور کرنے لگے، جو پھول نچھاور کر رہے تھے، انہوں نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

جماعت اہل حدیث کے بعض وہ سربر آوردہ اصحاب، جو اب تک، جمعیت خلافت کی تجاویز کے حامی تھے، حجاز میں ملوکیت کے مخالف تھے، اور وہاں منہاج خلافت راشدہ پر نظام حکومت رائج کرنا چاہتے تھے، جیسے ہی سلطان نے اعلان ملوکیت کیا، وہ ملوکیت کے حامی ہو گئے، اور پچھلے تمام اصول، بیان اور اعلان ان کے دل و دماغ سے محو ہو گئے۔

محمد علی نے ان مہربان راہ پر کئی بار نکتہ چینی کی، ایک مرتبہ انہوں نے

فرمایا:-

"اس (جماعت اہل حدیث) کے تعصب مذہبی کا ظہور تو اس وقت سے ہوا ہے، جب سے سلطان ابن سعود نے ملکیت کا اعلان کیا ہے، اور اس جماعت کے تسلیم کردہ سارے اصول اس شعر کے مطابق محو کر دیے گئے، ؎

من و دل گر فدا شویم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست"

اور "او" کی ضمیر اس وقت سے آج تک اپنے ایک ہم عقیدہ حکمران (سلطان ابن سعود) کی طرف ہی پھر رہی ہے!

اور "من و دل" میں تمام اصول اور جمعیت خلافت کیا اسلام و شریعت اسلامیہ تک داخل ہیں۔"

(۳ مارچ ۱۹۲۷ء)

محمد علی کی یہ چوٹ، ڈنکے کی چوٹ کی طرح کتنی بلند آہنگ اور چٹکی کی طرح کتنی دل میں اتر جانے والی ہے!

تبصرہ!

۲۱ جنوری ۲۷ء کے "ہمدرد" میں، محمد علی نے لارڈ ارون، (جو اب لارڈ ہالی فیکس کے نام سے مشہور رہیں) وائسرائے ہند کی ایک تقریر پر تبصرہ کیا، اس تبصرہ میں، برطانوی سامراج، حکمت علی، اور استعمار پر

جو خفی و جلی چوٹیں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں، ملاحظہ ہوں:-

"اگر نرم دل، نیک نہاد، خلق مجسم، لارڈ ارون، ہم ہندوستانیوں سے فرماتے کہ تم بڑے ضدی ہو، بڑے مفسد ہو، تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے، تم کشتنی اور گردن زدنی ہو، —— لیکن کوئی کہاں تک تم سے لڑے جھگڑے، لو یہ تمہارا سوراج، اب ہٹو ہمارے سامنے سے پھر اپنا کالا منہ ہمیں نہ دکھانا،

تو ہم سے قسم لے لو جو برا مانتے، ہم خوشی خوشی انکے در دولت سے چلے جاتے، اور پھر کبھی ان کی دلیز پہ قدم نہ دھرتے۔ مگر انہوں نے ایک گالی بھی نہیں دی، کسی کو برا بھلا نہیں کہا نہایت تہذیب، نہایت متانت، نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ مجھے آپ حضرات کے ساتھ بےحد ہمدردی ہے کاش میں آپ کی درخواست رد نہ کرتا، مگر کیا کروں، سخت مجبور ہوں، آپ کے جتنے بہی خواہ ہیں، ان میں ایک سے ایک بڑھ کر طبیب حاذق ہے، وہ سب یہی کہتے ہیں، کہ آپ کے منہ میں سیاسی حقوق کی کھیل اڑ کر نہ جائے، یقیناً فاقہ کشی کی تکلیف آپ کو بےحد محسوس ہوتی ہوگی، اور آپ میری اور میرے شرکائے حکومت کی شکم سیری پر ضرور رشک کرتے ہوں گے، مگر اطبار

کی رائے ہے، کہ ہم کو تجھ سے موت آئے، لیکن آپ کو
یہ مرض مبارک نہ ہونے پائے، بلکہ آپ ایک سوکھے
ٹکڑے کو ترس ترس کر جان توڑ دیں، امید ہے کہ آپ
بالکل اب مطمئن ہو گئے ہوں گے، خدا حافظ!
اس پر کوئی کہے تو کیا کہے؟ اگر یہ لارڈ اردون کی
ابتدائی سادہ لوحی نہیں ہے بلکہ انتہائی ہوشیاری
ہے، تو میں بھی ہندوستانیوں سے یہی کہوں گا کہ تمہارا
خدا حافظ!"

محمد علی کے یہ میٹھے بول تازیانے سے کم ہیں؟ یہ چوٹ یقیناً قابل دست اندازی پولس "نہیں تھی"، لیکن اس کے "ضرب شدید" ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا!

ایک اَور چوٹ!

ترکی حکومت آج سمٹ کر چند شہروں تک محدود ہو گئی ہے، لیکن جب قسطنطنیہ سارے مسلمانان عالم کا مرکز خلافت تھا تو ترکی حکومت کے مشرق و مغرب میں جھنڈے گڑے ہوئے تھے، بلقان کی ریاستیں اس کے زیر نگیں تھیں، حجاز، شام، عراق، مصر، طرابلس، پہ ترکی پرچم لہراتا تھا۔

انگریزوں کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی کہ ترکی رعایا کو، ترکوں کے خلاف بھڑکایا جائے، انہیں آزادی، اور خود مختاری کے سبز باغ دکھائے جائیں،

ان میں بغاوت اور سرکشی کے جراثیم پیدا کئے جائیں، چنانچہ ارمنی عیسائیوں کو آزادی کا، اور عرب ممالک کو "وحدت عربیہ" کا درس دیا گیا، اس جذبے کے ماتحت جب کوئی تحریک ترکوں کے خلاف اٹھی، ہماری سرکار ابد قرار کی طرف سے اس کی خفیہ یا علانیہ، جیسا موقع ہوا، حوصلہ افزائی کی گئی۔

۱۱ر نومبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں ضمناً محمد علی نے اس طرف بھی توجہ کی، اور فرمایا:-

"ترکوں نے اپنی عرب اور ارمنی رعایا کو تو حکومت کرنے کی
ایسی اچھی تعلیم دے دی تھی کہ برطانیہ ذمہ دار حکومت کی
عنان، ان کے ہاتھ میں فوراً دینے پر راضی تھی، تاہم،
ہندوستانیوں کو، خود برطانیہ نے، ڈیڑھ سو برس میں
(بھی) وہ تعلیم نہ دی!"

محمد علی کی چوٹ ہمیشہ گوشت پر پڑتی تھی، ہڈی پر نہیں، ہڈی کی چوٹ، ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے، اور گوشت کی چوٹ کی ترجمانی صرف آنکھیں، گریہ آلود، اور اشک ریز آنکھیں کر سکتی ہیں!

باب (۳)

جرح!

محمد علی پیشہ ور وکیل یا بیرسٹر نہیں تھے، جنہیں برجستہ سوال، اور برجستہ جرح کے فن میں غیر معمولی دسترس ہوتی ہے، لیکن پھر بھی وہ جرح کرتے تھے، اور ان کی جرح ایسی ہوتی تھی، جس کی کوئی کاٹ نہیں تھی، جس کا جواب نہیں بن پڑتا تھا، جو آدمی کو ہکا بکا کر دیتی تھی، یہ ملکہ انہیں خداداد طور پہ حاصل تھا۔

تحریر ہو یا تقریر، وہ جب جرح کرتے تھے، مخالف کو ساکت کر دیتے تھے، اور بہترین وہی جرح مانی جاتی ہے جس کا جواب نہ بن پڑے۔

بلد امین!

سلطان ابن سعود جب فرماں روائے حجاز بن گئے تو انہوں نے

بعض ایسے اقدامات کرنے چاہے، جو استعمار پسند ممالک کی طرف سے ان ملکوں میں رائج ہیں، جو ان کے غلام ہیں۔

مثلاً انگریز یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستانیوں کو مسلح کیا جائے، یہ انکی استعماری حکمت عملی کے خلاف ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ہتھیار پر لائسنس لینا ضروری ہے، اس کے برعکس آزاد ممالک میں ہر شخص آتشیں اسلحہ رکھنے کا مجاز ہے۔

چونکہ حجاز میں نیا نیا تسلط سلطان کا ہوا تھا، اور وہاں اس سے پہلے ہتھیار کے رکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے سلطان نے چاہا کہ حجازیوں سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں، یہ کام اگر زور و قوت کے بل پر ہوتا تو مزید خونریزی اور شورش کا اندیشہ تھا، لہذا اسے مذہب کا جامہ پہنایا گیا۔

مکہ میں مؤتمر اسلامی کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا، محمد علی بھی اس میں شریک تھے، مجلس مضامین میں ایک تجویز زیر بحث آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ حجازیوں سے ہتھیار رکھوا لئے جائیں اور اس کی توجیہ یہ کی گئی، کہ "بلد امین" میں کشت و خون کا امکان کم سے کم ہونا چاہئے، لہذا محفوظ صورت یہی ہے، کہ ہتھیاروں کے استعمال پہ پابندیاں عائد کر دی جائیں۔

محمد علی بھلا اس موقع پر کب چپ رہ سکتے تھے، انہوں نے تڑسے پوچھا:۔

"رسولؐ جب حدیبیہ پر آ کر رکے تھے، کیا اس وقت بھی مسلمانوں کے پاس تلواریں نہ تھیں"؟!

اس لاجواب جرح نے ایک سناٹا پیدا کر دیا، مجلس مضامین کے بھرے اجلاس میں سب خاموش تھے، محرک صاحب اس ہجوم میں بھی تنہا تھے!

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے "سناٹا" آواز نہیں آتی!

بتائیے!

ایک افواہ یہ اڑی کہ حاکم مدینہ نے روضۂ رسولؐ پر نجدیوں نے گولہ باری کر دی، بالکل غلط خبر تھی، لیکن سارے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا، محمد علی کی فراست ایمانی نے بھانپ لیا، کہ یہ دشمن کی اڑائی ہوئی افواہیں ہیں، اس لئے قطعاً ناقابل یقین ہیں۔

بعد میں واقعات نے بھی، محمد علی کی اصابت رائے کی تائید کر دی، ثابت ہو گیا کہ یہ محض افواہ تھی، اسے واقعہ اور حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔

اب محمد علی ان لوگوں سے جنہوں نے یہ افواہ اڑائی تھی، یا اس کی تبلیغ واشاعت میں حصہ لیا تھا، پوچھتے ہیں:-

"کیا آپ لوگوں کو اس سے خوشی ہوئی کہ آپ جھوٹے
ثابت ہوئے تو ہوئے، مگر روضۂ رسول اکرمؐ توہین وتخریب
سے بچ گیا؟ یا آپکو رنج ہوا کہ روضۂ رسول تو بچ گیا مگر آپ جھوٹے ثابت ہوئے؟
جھکی ہوئی گردنیں اس جرح کا جواب دے سکتی تھیں؟

ٹرنک کال

محمد علی کی ہستی سراپا رفق ومحبت تھی، شوکت صاحب کے فرزند دلبند شاہد علی مرحوم بستر مرگ پر دراز تھے کہ ان کی وفات کی افواہ اڑ گئی، محمد علی یہ سنتے ہی حواس باختہ ہو گئے، انہوں نے چاہا بمبئی ٹیلیفون کر کے خیریت معلوم کریں، تو معلوم ہوا، خلافت والوں پہ کسی ٹرنک کال کے سلسلے میں دو تین روپے باقی ہیں، اس لئے محمد علی کے ٹیلیفون کا سلسلہ خلافت کمیٹی کے ٹیلیفون سے نہیں ملایا جا سکتا۔

محمد علی نے کہا، لیکن میرا حساب تو بیباق ہے، ٹیلیفون تو میں کر رہا ہوں، تکلیف مجھے ہو رہی ہے نہ کہ خلافت والوں کو، یہ کیسا نامعقول قاعدہ ہے؟ ڈائرکٹر جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف نے ٹیلیفون ہی پر جواب دیا، نہایت معقول قاعدہ ہے۔

محمد علی نے کہا:-

"جو اپنی ٹرنک کال کا بل ادا کر چکا ہے، تکلیف اسے ہو رہی
ہے، نہ کہ اس کو جس نے اپنا بل ادا نہیں کیا ہے، پھر بھی
آپ اس قاعدہ کو معقول کہتے ہیں؟" (۱۴ر فروری سنہ ۱۹۲۷ء)

اس جرح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائرکٹر جنرل نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس لغو قانون کو بدلوانے کی کوشش کرے گا۔

باب (۴)

برہانِ قاطع و قاطعِ برہان

شوخی اور شگفتگی محمد علی کے غیر منفک اجزا رہتے، محمد علی کی ہر تقریر اور تحریر میں، یہ دونوں جوہر ضرور آپ کو ملیں گے، محمد علی کی ایک اور اہم ترین خصوصیت یہ تھی، کہ وہ اپنے نظریات و خیالات، معتقدات و تصورات کی بنیاد وقتی جذبہ، اور جوش پر نہیں رکھتے تھے، بلکہ ٹھوس اور مضبوط، مستحکم اور ناقابل شکست دلائل پر رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ نتیجہ سے بے پروا ہو کر رائے قائم کرتے تھے، اور مجاہدانہ عزم و استقامت سے اس پر اڑے رہتے تھے۔

جن لوگوں کو وہ بر سر غلط سمجھتے تھے، جن خیالات کو وہ ناقابل اعتنا سمجھتے تھے، ان کی تردید بھی کرتے تھے، یہ تردید بھی جذبات سے معرّیٰ ہوتی تھی، واقعات، دلائل، حقائق، اس کے اجزا ترکیبی ہوتے تھے۔

وہ ایسی دلیل پیش کرتے تھے، جس کی کاٹ آسان نہیں ہوتی تھی، وہ دوسروں کی دلیلوں کو اس طرح کاٹتے تھے کہ پھر اس کا توڑ ممکن نہیں ہوتا تھا۔

انسان اور حیوان

۱۳ مئی ۱۹۲۵ء کے "ہمدرد" میں انھوں نے ضمناً ایک بڑے معرکہ کی بات کہی، انھوں نے انسان اور حیوان کے مابہ الامتیاز پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:—

"آدمی اپنی نسلی جائے پیدائش، رنگت وغیرہ پر قابو نہیں رکھتا، اس لئے ان (چیزوں) کا امتیاز (حیوانوں کے لئے تو ٹھیک ہے مگر) ایک خود مختار حیوان کے لئے ہرگز موزوں نہیں، اس کے لئے تو وہی امتیاز موزوں اور اس کے شایان شان ہے، جو خود اس کا اختیار کردہ ہو، اور یہ امتیاز صرف عقیدہ کا امتیاز ہے!"

نسل و رنگ کی مخالفت میں، بہتوں نے دلیلیں دی ہیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے کوئی دلیل بھی اتنی وزنی نظر سے گزری ہے؟

دلچسپ دلیل

گنبد خضرا پر گولہ باری کی جو افواہ دشمنوں نے اڑائی تھی، اس کی

تردید کرتے ہوئے، محمد علی نے بڑے دل نشین انداز میں فرمایا۔

"نیوٹن کے زمانہ میں انگلستان میں سائنس کے لئے رائل سوسائٹی، بادشاہ چارلس دوم کی سرپرستی میں قائم ہوئی، اس میں کسی نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ ایک برتن میں پانی لبالب بھرو، اور اس میں زندہ مچھلی ڈالو، تو پانی نہیں چھلکتا۔ لیکن مُردہ مچھلی ڈالو تو چھلک جاتا ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

مختلف لوگوں نے مختلف وجوہ بیان کئے، آخر یہ مسئلہ نیوٹن کے سامنے پیش کیا گیا، اس نے دو طشت منگائے، پانی سے لبالب بھر دیے، مُردہ مچھلی ڈالی، پانی چھلک گیا، زندہ مچھلی ڈالی جب بھی چھلک گیا، سب چُپ ہو گئے، سب کی توجیہیں غلط ہو گئیں!

یہ لوگ تحقیق حالات تو کرتے نہیں، نیوٹن کے معاصرین کی طرح لگے اس کی وجہ اور سبب بتانے!"

(۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

محمد علی نے جب نیوٹن کی طرح، پانی کے دو طشت منگائے، اور انہیں افواہ، اور بازاری گپ کی زندہ اور مُردہ مچھلی کو ڈالا، اور پانی چھلک گیا، تو ۱۹۲۵ء میں بھی سب چُپ ہو گئے، سب کی توجیہیں غلط ہو گئیں!"

روضۂ رسولؐ اور سنّتِ رسولؐ

اس زمانہ میں، جب آویزش نجد وحجاز نے مسلمانان ہند کو، دو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا، اور مسلمانوں کے دشمن اس افتراق سے فائدہ اٹھا کر، مسلمانوں کو گنبد خضرا پر گولہ باری، اور اسی طرح کی دوسری خبروں پر متوجہ کر کے ان کے جذبات سے کھیل رہے تھے، اور چاہتے یہ تھے کہ مسلمان اصل مسئلہ پر متوجہ نہ ہوں، بلکہ "نجد اور یاران نجد" کے قضیے میں پھنسے رہیں، محمد علی نے عقل پر جذبات کو، حقائق پر خبروں کو واقعات پر انکار کو۔ غالب نہیں آنے دیا۔

جذبات کی شورش اور طوفان کے عین اس ہنگامہ میں محمد علی آیا، وہ جذبات کے سمندر میں بہا نہیں، بلکہ اس نے بہتے ہوؤں کو کنارے پر لگایا، اور پھر انہیں حقیقت کی گلپوش وادی میں لا کر کھڑا کر دیا، اس نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں، روضۂ رسولؐ سے زیادہ محترم سنت رسولؐ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔"

(۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

آلِ شریف

حسین شریف مکہ نے، جس طرح خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کی

جس طرح، مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچایا، جس طرح ملت اسلامیہ کے وقار کو مجروح کیا، جس طرح انگریزوں سے ساز باز کی، اس سے سب واقف ہیں۔

تطہیر حجاز کے مقصد سے، جب سلطان ابن سعود میدان میں آئے، اور انہوں نے آل حسین کا مقابلہ شروع کیا، تو ہندوستان کی وہ جماعت، جو شریف حسین کی دراز دستیوں سے خوب واقف تھی، صرف اس لئے اس کی حمایت کر رہی تھی کہ وہ سید ہے، آل رسولؐ ہے، یعنی حجاز برباد ہوتا ہے تو ہو، ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچتا ہے، تو پہنچے، حجاز پر استعمار فرنگ کا اثر پہنچتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، خلافت اسلامیہ اور خلیفۃ المسلمین کو گزند پہنچانے والے حسین، اور اس کی اولاد کو حجاز پر قابض رہنا چاہیے۔

اس دلیل کا جواب محمد علی نے دیا ہے، اب ان کی دلیل سنئے:-

"کسی سنی مسلمان نے ۱۳ سو برس میں اپنے منہ سے قبول نہیں کیا کہ باغ فدک حضرت فاطمہؓ کا ورثہ تھا، پھر عرب کی مقدس سرزمین کو ہم محض آل شریف حسین کا ورثہ کس طرح سمجھ لیں؟"

(۲۷ نومبر ۱۹۲۵ء)

یہ تھی وہ قاطع برہان، جسے اپنے جلو میں لے کر محمد علی آگے بڑھ رہے تھے، اور بڑھتے چلے گئے تھے۔

اقلیت کا مطالبہ!

ملک دوست اور قوم پرور ہونے کے باوجود، اکثریت کی چیرہ دستیوں اور اقلیت کے جائز مطالبات کے وہ حامی تھے، وہ نیشنلزم پر، اپنی قوم و ملت کے حقوق نچھاور کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھے۔

کانگرس اور نیشنلسٹ حلقہ کی طرف سے بار بار فرمایا جاتا تھا، اقلیت کا فرض ہے کہ اکثریت پر بھروسہ کرے، اکثریت یقیناً اس کے ساتھ شرافت اور انسانیت کا برتاؤ کرے گی۔

محمد علی نے یہ سب کچھ سنا اور فرمایا:-

"آج تک ہندوستان میں مجارٹی (اکثریت) کی حکومت کبھی نہ ہوئی تھی، نہ ہندوؤں کے عہد میں، نہ پانڈوں کے عہد میں، نہ کوروں، رام چندرجی، سری کرشن، اشوک بدھ، بکرماجیت، اور پرتھی راج نے قائم کی، اور نہ مسلمانوں کے دور میں، محمود غزنوی، علاء الدین خلجی، محمد تغلق، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، وغیرہ نے اور اسی طرح برطانوی حکومت میں رنجیت سنگھ، سکھ دیو، ہیسٹنگز، ولزلی، کرزن ریڈنگ، اور ارون نے بھی مجارٹی (اکثریت) کی حکومت نہیں بنائی، لیکن ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے رو سے (یعنی نہرو رپورٹ کی رو سے) جو حکومت قائم

ہو گی، وہ مجارٹی اور اکثریت کی ہو گی، اور اس صورت میں حکومت ہندوؤں کی ہو گی۔

ان حالات میں اگر اقلیت کچھ تحفظ چاہے تو پھر کس طرح اسے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟"

(۲۶ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

یہ وہ برہان قاطع تھی جس کا جواب نہ موتی لال سے بن پڑا، نہ موہن داس کرم چند گاندھی سے، نہ ڈاکٹر انصاری سے، نہ ڈاکٹر محمود سے!

علیحدگیٔ سندھ

مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ سندھ کو جداگانہ صوبہ بنایا جائے، تاکہ وہ بغیر رکاوٹ اور مداخلت کے ترقی کرے، لیکن ہندوؤں کی طرف سے ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی، اور نئے نئے عذر پیش کئے گئے، ایک بڑا عذر یہ تھا، کہ اس کی آمدنی اتنی کم ہے کہ وہ اپنا کفیل نہیں ہو سکے گا۔

محمد علی سمجھتے تھے، ؎

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

علیحدگیٔ سندھ کی مخالفت ہمدردی کی بنا پر نہیں کی جا رہی ہے،

بلکہ اس لئے کی جا رہی ہے کہ وہ بمبئی کے دستِ اقتدار سے آزاد ہو جائیگا جو خالص ہندو صوبہ ہے، اور مسلمان صوبوں میں ایک نئے صوبہ کا اضافہ ہو جائے گا۔

علیحدگیٔ سندھ کی مخالفت کا جذبہ عام ہندوؤں یا صرف مہا سبھائیوں ہی میں نہیں تھا، بلکہ اس میں کانگرس کے "غیر متعصب اور رواداری" وطن پرست بھی شریک تھے۔

اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے محمد علی نے کہا:-

"سندھ پر انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں قبضہ کیا تھا، لیکن اگر بمبئی سے پہلے یہ قبضہ میں آیا ہوتا تو یقینی اس سے علیحدہ ہوتا، اب جب کبھی اس کو مستقل صوبہ قرار دے جانے کا مطالبہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے، اس کی اقتصادی حالت اس امر کی مقتضی نہیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے تو کہاں کا انصاف ہے کہ بمبئی کے خزانہ سے تو روپے دئے جائیں، لیکن دہلی کے مرکزی خزانہ سے نہ دئے جائیں، پھر یہ کہاں کی دیانت ہے کہ غریب کو محض اس لئے غلام بننے پر مجبور کیا جائے کہ وہ غریب ہے!"

(۲۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

اکثریت کے دل پر یہ دلیل بھی اثر نہ کر سکی، یہاں تک کہ ایک روز خود وزیر ہند نے علیحدگیٔ سندھ کا اعلان کر دیا، اور جو ناممکن تھا، وہ

بیک گردش چرخ نیلوفری ملک ہوگیا۔ !

فساد انگیز انتظامات

گائے اور باجہ کے سلسلے میں اب سے چند برس پہلے تک جو خونریز فسادات ہوا کرتے تھے، ان کا سلسلہ اب بہت کم ہوگیا ہے، ان فسادات کے عوامل اور محرکات میں جہاں اور چیزیں شامل تھیں، وہاں حکومت کے "فساد انگیز" انتظامات کو بھی خاصا دخل تھا۔

اِن مسائل کے متعلق ضرورت اس کی تھی کہ سارے ہندوستان میں ایک اصول پر عمل کیا جاتا لیکن ہر جگہ، رواج اور تعامل کے مطابق، نئے نئے فیصلے حکومت کرتی رہتی تھی، یہ بھی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی بہترین حکمت عملی تھی۔

اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بار محمد علی نے لکھا:۔

"اس طرح تاقیامت یہ جھگڑا طے نہ ہوگا، کہ کلکتہ میں ایک قاعدہ جاری ہو، اور ناگپور میں دوسرا، اور دہلی میں تیسرا اور کسی سال پہاڑی دھیرج سے گائے نکالنے پر مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جائے، اور کسی سال فوج لاکر ہندوؤں کو مرعوب کیا جائے۔

قاعدہ سارے ہندوستان میں ایک ہو، اور ایک ہی اصول پر بنایا جائے، اگر سڑکیں، بُت پرستوں کے جلوسوں،

اور باجے گاجے کے لئے، کھلی ہوں، تو بکی ہوئی گایوں کو بھی مذبح میں لے جانے کے لئے، اور وہاں سے گوشت ٹوکروں میں لانے کے لئے کھلی ہوں، ورنہ ہندو مسلمان دونوں ملتوں کو ایک دوسرے کے مذہبی احساس و جذبات کا پاس و لحاظ رکھنے پر مجبور کیا جائے، اور ہر جگہ، اور ہر حالت میں اس پر عمل کیا جائے۔"

(۲۵ر نومبر ۱۹۲۶ء)

خلافت کا غبن

ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت کمیٹی کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے لاکھوں روپیہ دیا، علی برادران کے دوران اسیری میں کئی لاکھ روپیہ سیٹھ چھوٹانی نے جو جمعیت خلافت کے ایک بہت بڑے عہدہ دار تھے، اپنے کاروبار میں لگالیا، پھر وہ دیوالیہ ہوگئے، اور یہ روپیہ پورا نہیں وصول ہوسکا۔

اس واقعہ سے مسلمانوں میں خلافت کی طرف سے بالخصوص اور چندہ دینے کے بارے میں بالعموم ایک عام سرد مہری پیدا ہوگئی تھی۔

محمد علی بھی اس کے قائل تھے کہ جو کچھ ہوا، بُرا ہوا، لیکن وہ اس کے قائل نہیں تھے، کہ اب قومی کام ہی بند کردیا جائے، ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اظہار خیال فرمایا:۔

"میری لڑکی علیل ہے، فرض کرو کہ اسے علاج معالجہ کیلئے سو روپیہ کی ضرورت ہے، میرے پاس روپیہ بھی موجود ہے، مجھے اس کی محبت بھی ہے، یہ تین چیزیں ہیں، اب اگر میں روپیہ کسی شخص کے ہاتھ بھیجوں اور وہ آدمی اس روپیہ کو میری لڑکی تک نہ پہنچائے، تو میں کیا کروں گا۔ اگر میری لڑکی کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور مجھے اس کی محبت ہے، اور میرے پاس روپیہ بھی ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کروں گا کہ روپیہ بھیجوں، اور جب تک ان تینوں چیزوں میں سے ایک میں کمی نہ ہو، تب تک برابر بھیجتا رہوں خواہ وہ کتنی بار غبن کیوں نہ کیا جائے! صرف اس حالت میں روپیہ بھیجنا بند کروں گا جب کہ بیٹی کی ضرورت مٹ جائے یا میرے پاس روپیہ نہ رہے! یا روپیہ ہو مگر بیٹی کی محبت دل میں نہ رہے!

(۱۸ر جنوری ۱۹۲۵ء)

منزل مقصود

محمد علی وقتی جوش کے ماتحت کسی کام کے کرنے کے قائل نہیں تھے، وہ چاہتے تھے، آدمی خوب سوچ لے، سمجھ لے، بار بار غور کرلے، پھر ایک راستہ متعین کرکے کام ورسا ہو جائے، اور اس وقت تک نہ مڑے جب تک

منزل مقصود سامنے نہ آجائے۔

اس خیال کو انہوں نے بار بار ظاہر کیا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"ہم کو جلد جوش میں نہ آنا چاہیے، بلکہ بغیر جوش کے کام کئے جانا چاہیے، جس طرح سمندر میں ایک جہاز چلتا ہے، اسے خیال نہیں ہوتا کہ سمندر کی سطح ہموار ہے یا نہیں؟ نہ اسے طوفان کی پرواہ ہوتی ہے، موجیں جہاز کے تھپیڑے مارتی ہیں، لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ سیدھا منزل مقصود کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، جس موج کا جی چاہے اس سے ٹکرائے، اور منہ کی کھا کر واپس جائے، وہ اس کی طرف سے بے التفاتی برتتا ہے، اس کی ساری توجہ منزل مقصود کی طرف ہوتی ہے، اور بغیر وقت ضائع کئے ہوئے وہ آخرکار منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، اور ساحل مراد سے جا لگتا ہے۔"

(۲ر جنوری ۱۹۲۵ء)

کم از کم محمد علی اسی طرح چلا، اور آخرکار منزل مقصود تک پہنچ گیا!

مچلکے!

مارچ ۱۹۲۷ء میں مسلمان رہنماؤں کے ایک بے ضابطہ اجتماع میں جس میں محمد علی بھی شریک تھے، کامل غور و فکر کے بعد، یہ طے ہوا کہ ہندو صوبوں میں ہندوؤں کی، اور مسلمان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت آئین و دستور

کے رو سے قائم کی جائے، تو مسلمان چند اور شرائط کے ساتھ جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو جائیں گے، اور مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے۔

اس فیصلہ میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا، وہ "ہمدرد" میں مقالے لکھ لکھ کر بار بار اپنے قارئین کو سمجھاتے تھے، کہ اگر انہیں کانگرس اور مسلم لیگ قبول کر لیں، ہندو مسلمان مان لیں، تو ان سے دُور رس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک بار فرمایا:-

"(فیصلۂ مارچ کی رو سے) دونوں ملتیں آزاد کر دی گئی تھیں، کہ اگر چاہیں تو تعصب اور تنگ نظری سے کام لے کر جہاں جہاں اکثریت حاصل ہو اقلیت کے خلاف کارروائیاں کریں، اور اس پر زیادتیاں کریں، اور اس کے ساتھ ناانصافی کریں اور جہاں جہاں ان کی اقلیت ہو، اس کی (اکثریت کی) مخالفت، زیادتی، اور ناانصافی کا خمیازہ اٹھائیں، دونوں کی شرافت اور دونوں کی شرارت کا امتحان ہے، اگر اقلیت کے ساتھ ہی شرافت کا برتاؤ کریں گے تو جہاں ان کی اقلیت ہوگی، اس کے ساتھ بھی شرافت کا برتاؤ کیا جائے گا، اور اقلیت کے ساتھ اگر شرارت کا برتاؤ کریں گے، تو لامحالہ جہاں ان کی اقلیت ہوگی، اس کے ساتھ بھی شرارت ہی کے برتاؤ کی توقع رکھنی پڑے گی۔

حقیقۃً دونوں ملتوں کے مچلکے لئے جا رہے ہیں، یہ مچلکے اور یہ ضمانتیں جو ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں وہ مچلکے اور ضمانتیں نہیں ہیں، جو ہمارے اجنبی حکمران ہم کو مجرم سمجھ کر ہم سے طلب کیا کرتے ہیں، بلکہ وہی مچلکے اور ضمانتیں ہیں جن کی طرف ہر سچے مذہب کے اس سنہرے قاعدہ نے اشارہ کیا ہے، کہ دوسروں کے ساتھ وہی کرو، جو تم چاہتے ہو، کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں"!

(۲۴ دسمبر ۱۹۲۷ء)

مغربی بدعت!

سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے سلسلہ میں بار بار جمہوریت اور ملوکیت کا ذکر تحریروں اور تقریروں میں آیا کرتا تھا، حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اس سلسلہ میں جمہوریت کیلئے "مغربی بدعت" کا لفظ استعمال فرمایا، اب محمد علی سے ضبط نہ ہو سکا اس احترام کے باوجود جو ان کے دل میں، حضرت مولانا کا جاگزیں تھا، انہوں نے مولانا کے بیان پر ایک جامع و مانع تبصرہ کر ڈالا۔

اپنے اس تبصرہ میں انہوں نے فرمایا:-

"حجاز کی مقدس سرزمین پر ایک عہد شکن، نیز قبہ شکن، بادشاہ (ابن سعود) کے قبضہ جما لینے پر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی

کا دل اس قدر باغ باغ ہوا کہ وہ جمہوریت کو مغربی بدعت کہنے لگے، اور سلطان ابن سعود کی مطلق العنانی کو عین شریعت اسلامی ظاہر کرنے لگے۔ اور چونکہ "وشاورھم فی الامر" کی نص صریح سے عہدہ بر آہونا آسان نہ تھا اس لئے ربر کو جس طرح ضرورت کے وقت خوب کھینچا جاسکتا ہے، تاویل کے ذریعے سے نص صریح سے بے ادبی کی گئی، اور فرمایا گیا کہ ہاں "وشاورھم فی الامر" تو صحیح ہے، مگر یہ ولایت کے پڑھے ہوئے جو مولانا بن بیٹھے ہیں، ان الفاظ کو بھول گئے، کہ "وان عزمت فتوکل علی اللہ!"

ایسے بلند پایہ عالم کے قلم سے، جب ایسی تاویلیں نکلنے لگیں تو کس طرح مسلمانوں کی حالت پر رونا نہ آئے۔

تعجب ہے کہ مولانا نے جو حقیقتہً ولایت کے پڑھے ہوئے نہیں ہیں، جنہیں فرنگی محل نے بھی مولانا کا خطاب نہیں عطا فرمایا ہے (محمد علی کو عطا ہوا تھا) (ان) الفاظ کو تو یاد رکھا مگر یہ بھول گئے کہ "وان عزمتم" نہیں ہے، بلکہ "وان عزمت" ہے اور یہ خیال نہیں فرمایا کہ "عزمت" کی ضمیر سلطان ابن سعود جیسے غیر معصوم اور خاطی بادشاہوں کی طرف نہیں پھرتی، بلکہ ایک معصوم اور غیر خاطی نبی سردار

کونین اور باعث تکوین دو عالم کی طرف پھرتی ہے جس کا عزم بالجزم سوا خدا کے کسی کی امداد کا محتاج نہیں تھا!"

(۲۳ر نومبر ۱۹۲۷ء)

محمد علی، عالم نہیں تھے، لیکن ایک بڑے عالم کو اس کی لغزش پر ٹوک سکتے تھے؎

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

عجیب نسخہ

شاعر مشرق علامہ اقبال نے، ایک مرتبہ پنجاب کونسل میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ اعلیٰ عہدوں پر انگریزوں کا تقرر کیا جایا کرے، تاکہ "ہندو مسلم" تلخیاں، شکایتیں، اور بدمزگیاں پیدا نہ ہوا کریں۔

محمد علی کے دل میں اقبالؒ کی بڑی عزت اور محبت تھی، وہ اقبالؒ کی شاعری ہی تھی جس نے محمد علی کو اسلام کا شیدا بنایا تھا، اور اس کے اعتراف میں محمد علی کو کبھی تامل نہیں ہوا، لیکن اس عزت و محبت کے باوجود اقبال کی یہ بات محمد علی کو پسند نہ آئی، اس نے، "طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ" کے عنوان سے "ہمدرد" میں ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا۔ اور اقبال کے خیالات کا رد کیا، ایک جگہ فرمایا:-

"وہ (اقبال) آج ہمارے مرض کا علاج اسے نہیں سمجھتے کہ

ہندوؤں کو عزت دلانے کی کوشش کی جائے کہ اقلیت کے ساتھ نا انصافی نہ کی جائے، جب تک اس کو رام نہ کرلو گے، ہندوستان کو آزاد نہ کرا سکو گے، سوراج نہ لے سکو گے، اس کے استیصال کا خیال حماقت نہیں جنون ہے۔

جب محمد بن قاسم مٹھی بھر مسلمانوں کو لے کر سندھ میں داخل ہوا، تب اس کے استیصال کا اچھا موقع تھا، تم نے اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیا، جب محمود غزنوی ۱۷ بار ہندوستان آیا، اور سارے ملک میں گھوما پھرا، اگرچہ چند ہزار فوج کے ساتھ، تب بھی موقع تھا کہ اس اقلیت کا استیصال کر دیا جائے، اس وقت میں تم نے اس کا استیصال نہ کیا اور موقع ہاتھ سے جانے دیا، اس کے بعد شہاب الدین غوری آیا، اس وقت بھی اس کے استیصال کا موقع تھا لیکن تم نے اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے دیا، غلاموں کے خاندان تک نے یہاں بادشاہی کی، اور تم نے اسے بھی قبول کر لیا، خلجی، تغلق، سکندر لودی، سب باری باری حکومت کرتے رہے، اور تم نے کسی کا بھی استیصال نہ کیا، (البتہ) وہ خود ہی ایک دوسرے کا استیصال کرتے رہے۔

پھر ایک فرغانہ سے بھاگا ہوا مغل، تیمور لنگ کے خاندان کا ایک چغتائی بابر یہاں آیا، اور تم نے اس غریب الوطن کی اس طرح مہمان نوازی کی کہ سارا گھر بار اسے دے ڈالا اس کے بیٹے کو یہاں سے نکالا بھی، تو اس کے بھائیوں نے، یا مسلمان پٹھانوں نے، اور ان پٹھانوں کے ہاتھ سے عنان حکومت نکلی تو پھر اسی کے ہاتھوں میں آ گئی، اور اس کے بعد بھی بنئے بقال اس ملک کی حکومت مغلوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے، جو رانا سانگا جیسے راجپوت پر غالب آئے تھے، اور ایک مغل بچہ پھر اس پر حکمران ہو کر رہا۔

تم نے سکھوں کو بھی جو اسلام سے بہت ہی قریب آ گئے تھے، مغلیہ حکومت سے بھڑا دیا، تب بھی سوا اس کے کچھ نتیجہ نہ نکلا کہ بجائے دو مذہبی جماعتوں کے تین بن گئیں۔

جب اورنگ زیب کے بعد چند ہی سال تک کئی بار بھائیوں بھائیوں میں پھر تخت کے لئے جنگ چھڑی، اور جو جیا وہ عیاشی میں پڑ گیا، اور مرہٹوں کی قوت جسے اپنا مطیع و منقاد بنانے کا عزم بالجزم کر کے اورنگ زیب دلی گئے تھے، اور ۲۶ برس تک اس میں مصروف رہے، اور بالآخر اس قوت کو دبا کر انہوں نے دم لیا، ادھر دم دیا تو وہ قوت پھر بڑھنے لگی، اور ایک سیواجی کی جگہ چار مرہٹے راجہ برہمن

پیشوا کے درباری بنے، اور جب نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت کو بالکل ضعیف کر کے چھوڑ دیا، تو سب نے مل کر اتنی ہمت کی کہ دہلی پر دھاوا بول دیا، اس وقت بھی ایک غریب الوطن پٹھان احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کو اس طرح شکست دی کہ پھر کبھی اس قوم نے شمال کا رُخ نہیں کیا، بھاؤ جی سندھیا جیسا بہادر پانی پت سے اس طرح بھاگا تھا کہ ساری عمر وہ اس تعاقب کرنے والے پٹھان کو نہ بھولا، جس کا چھوٹے قد کا گھوڑا اس کے پیچھے برابر چلا آ رہا تھا، اور اس کے . . . .
نتھنوں سے نکلی ہوئی بھاپ جسے وہ بار بار مڑ کر دیکھتا تھا تو لرز جاتا تھا، جس کی یاد ساری عمر اسے خواب کی طرح ستاتی رہی، وہ آخری موقع تھا کہ تم اس اقلیت کا استیصال کر سکتے مگر تم نے اس کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔

نہ ڈاکٹر صاحب اسے ہمارے مرض کا علاج سمجھتے ہیں، کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں، اور ان سے کہیں کہ گو یہ یقینی امر ہے کہ تمہیں ایک خدا کی خاطر ساری خدائی سے لڑنا پڑے گا، لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری خدائی سے نہیں لڑ سکتے، دشمنوں میں سے ایک کو چھانٹ لو جسے تم "الد الخصام" سمجھتے ہو، اور اگر ہو سکے تو اس کے خلاف اوروں کو اس طرح اپنا حلیف بنا لو، جس طرح رسول اکرمؐ

نے یثرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنایا تھا۔

اگر کوئی جماعت بھی تمہارے سیاسی تدبر سے رام ہو کر تمہاری حلیف نہ بن سکے، تب بھی ہر محاذ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف مدافعت کرتے رہو، اور اس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے، پورا زور لگا دو، جب فتح حاصل ہو جائے، اس وقت دل کھول کر ایک ایک کر کے ہر دشمن سے انتقام لے لینا، یہ نامردی نہیں ہے بلکہ اسے عزم امور کہتے ہیں۔

اگرچین و عرب بھی تمہارا ہے، اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم مسلم ہو سارا جہاں تمہارا وطن ہے، تو اس دشمن کو "الد الخصام" سمجھو، جو سارے جہان پر حاوی ہونا چاہتا ہے، یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے، یہ تو گولر کا بھنگا ہے جس کی ساری دنیا اسی گولر میں محدود ہے، ایمان سے کہو کیا تم اس سے خائف ہو؟

ریل کے کسی ڈبہ میں چھ سات ہندو ہوں، اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ، کیا تمہیں ان سے ڈر لگے گا، بعض اوقات تو انہی کو تم سے ڈر لگتا ہے، البتہ اس ڈبے میں دو چار گورے ہوں تب تم کو، اور ان کو دونوں کو ڈر

لگتا ہے، اور اسی کا فکر رہتا ہے کہ یہ ماریں گے، یا سامان
پھینک دیں گے، یا گالی دیں گے، یا اپنے پاؤں دبوائیں گے
اگر تم کو ہندوؤں سے لڑنا ہی ہے تو کس ہتھیار سے لڑو گے؛
لٹھ پونگے ہیں تو اب بھی در رہتے ہو، آج اگر انگریز بیچ میں
کود نہ پڑیں، تو تم اب بھی ان سے بھگت لے سکتے ہو، مگر
انگریز تمہیں بھگت لینے دیں گے؛ ایک دفعہ بھی تو آج تک
دن بھر لڑائی نہ ہونے پائی، پولس آجاتی ہے، فوج آجاتی
ہے، اور تم اس سے دبک کر بیٹھ جاتے ہو۔

پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے، جن مسلمانوں کے لئے
تم گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتے تھے کہ سرکاری نوکریاں
انہیں دی جائیں، وہ تو اس خوف کے مارے کہ کہیں سرکار
ان کو متعصب اور طرف دار سمجھ کر برخاست نہ کردے،
بعض وقت خود ہی ناکردہ گناہ مسلمانوں تک کو پھنسوا دیتے
وہ تو ہندو ہی ہیں جو خود تمہارے قول کے مطابق اپنے
مجرموں تک کو چھڑا دیتے ہیں، اور جو ہندو مہا سبھا کے صدر
سے بقرعید کی صبح کو ٹیلیفون پر احکام لیا کرتے ہیں کہ کس محلہ
میں، اور کس بازار میں، اور کس گلی میں زیادہ پولس لگائی
جائے؛

جب مقدمات کچہری میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے

یہاں وکیلوں کا کال پڑ جاتا ہے، خود تمہارا بیان ہے کہ
عبدالرشید (قاتل سوامی شردھانند) کے مقدمہ میں
ایک بیرسٹر صاحب نے چار سو روپیہ روز رکھوا لئے، اندڈ
میں آج بھی آصف علی صاحب (بیرسٹر، دہلی) مشہور کانگرسی
جن کے انتخاب میں بوڑھے، اور مفلوج مسلمان تک پالکیوں
میں بیٹھ کر ووٹ دینے آئے تھے، غریب مل کے مزدوروں سے
دس ہزار روپیہ اپنے لئے، اور ایک ہزار اپنے منشی کے لئے
ٹھہرا چکے تھے، اور بنگلہ کا کرایہ ستر روپیہ ماہوار علیحدہ، اور
کھانے کے خرچ کے لئے اس پہ ۵۰ ماہوار مستزاد، اور
ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار موٹر کا خرچ سونے پر سہاگہ اور
آپ (مسٹر آصف علی) فرماتے ہیں کہ یہ تو اس امید پر ٹھہرایا
گیا تھا کہ مقدمہ ڈھائی ماہ میں ختم ہو جائے گا، ڈھائی ماہ نہ سہی
۳ ماہ سہی، گویا ۱۴ ہزار ۳ روپیہ آپ کو ملا، جو چیف کمشنر دہلی
کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہے، اور اگر اس کے بعد میری
(آصف علی) کی حاجت ہے، تو سو روپیہ روزانہ دلواؤ
میں تو دہلی میں چار سو روپیہ روز کماتا ہوں، حالانکہ شاید
آپ آج بھی انکم ٹیکس نہیں دیتے، اور یقیناً چار سو روپیہ
روزانہ کے مقابلہ میں چار سو ماہوار سے اقرب ہے۔
جب حالت یہ ہو تو کیا بہتر نہیں ہے کہ فسادات سے جہاں

تک ہو سکے بچا جائے"۔

(۲۱ اگست ۱۹۳۶ء)

طویل تر تحریر کا یہ مختصر ترین اقتباس ہے، ایک ایک حرف نگینہ کی طرح جڑا ہوا، ایک ایک لفظ حقائق کا آئینہ، ایک ایک جملہ واقعات کی تصویر ہر ہر دلیل، محکم!

دھاندلی

آئین و قانون کے نام پر محمد علی کو نہ مرعوب کیا جا سکتا تھا، نہ مغالطہ دیا جا سکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ایسے موقعوں پر کوئی ہو، بپھر جاتے تھے۔

کراچی جیل سے انہوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو اپنی والدہ محترمہ بی اماں کو ایک خط لکھا تھا، اس کا اقتباس ذیل خاص طور پر اہم ہے!

"مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ اب تم پر ایک مستقل جرم کا الزام لگایا گیا ہے، اس لئے ضمانت طلبی کی کارروائی بند کئے دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے قانون میں صاف درج ہے کہ ملزم کی حاضری کے بعد تفتیش شروع کر دی جائے، بند کرنے کا آپ کو اختیار نہیں ہے اگر ہو تو قانون کا حوالہ دیجئے، حوالہ تو نہ دے سکا، مگر کہا کہ میں اپنے اختیار سے کارروائی بند کرتا ہوں، میں نے کہا کہ میں آپ کے ضلع میں نہ پہلے تھا نہ اب رہنے کا ارادہ تھا

راستہ میں آپ نے بلا وجہ روک لیا، اور وجہ یہ بتائی کہ تم یہاں فتنہ و فساد برپا کرو گے، حالانکہ میں چند ہی منٹ میں مدراس کو جانے والا تھا، اس الزام کی بنا پر بھی مجھ پر سمن نکالا جانا چاہئے تھا، مگر آپ نے اس بہانہ سے وارنٹ جاری کیا کہ اگر میں گرفتار نہ کیا جاتا تو مجھے فتنہ و فساد سے باز رکھنے کی اور کوئی تدبیر نہ تھی! اور اب آپ یہ تمام کارروائی کالعدم کئے دیتے ہیں، نہ مچلکے مانگتے ہیں، نہ جیل بھیجتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جانتے تھے کہ نہ میں آپکے ضلع میں رہنا چاہتا تھا، نہ فساد برپا کرنے کی نیت رکھتا تھا، نہ اس سے پہلے کبھی فساد برپا کر چکا تھا۔

لیکن آپ کی گورنمنٹ چاہتی تھی کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں، کیونکہ میرے لئے کراچی سے وارنٹ نکل چکا تھا، مگر اب تک وہ لیٹر نہ پہنچا تھا، اس لئے اس کے آنے تک یہ بہانہ ڈھونڈھا گیا کہ میں فساد برپا کرنے والا تھا، اور اس کی روک تھام بلا میری گرفتاری کے ناممکن تھی، اس لئے گرفتاری کا وارنٹ آپ نے نکالا، اور بلا مچلکے لینے کی نیت کے مچلکے طلب کئے، میں ایک حرف بھی تلخ و ترش کہنا نہیں چاہتا، مگر آپ خود غور کیجئے آپ ضلع کے مجسٹریٹ ہیں، نہایت اہم اور فوری ضرورتوں کے لئے جن کا صاف صاف اظہار و تعین،

قانون نے کر دیا ہے، آپ کو گرفتار کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے مگر ایک بالکل دوسری غرض سے آپ نے مجھے گرفتار کر لیا۔ آپ کو دعویٰ ہے کہ آپ قانون کے محافظ ہیں، اور لوگوں کو قانون شکنی کی سزا دینا آپ کا منصب ہے، اور پھر آپ خود ہی قانون کو توڑتے ہیں۔؟

مجسٹریٹ کی یہ دھاندھلی کامیاب رہی، اس لئے کہ وہ مجسٹریٹ تھا لیکن محمد علی نے اسے یہ بتایا کہ وہ کتنے پانی میں تھا!

قانونی مشورہ!

معلوم ہے کہ محمد علی وکیل یا بیرسٹر نہیں تھے، لیکن قانون پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، وہ قانونی مشورے دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے، اور بعض وقت تو ایسی جچی تلی رائے دیتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

دہلی میں قلعہ کے پاس ایک مسجد تھی، جسے ہندوؤں نے اپنا لیا تھا اس کے کتبہ کو مٹا کر دوسرا پتھر لگا دیا تھا، جس پر "اوم" لکھ دیا تھا، دہلی کے مسلمانوں میں اس واقعہ سے بڑا ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔

شہر کے چند معززین کے ساتھ محمد علی بھی "موقعہ واردات" کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے، مصور فطرت، خواجہ حسن نظامی صاحب کا بیان ہے:۔

"مولانا محمد علی صاحب نے ایک نہایت دلچسپ قانونی بات پیدا کی کہ یہ واقعہ شہادت کی دفعہ میں آتا ہے، کہ مسجد کے

اوپر لفظ "اللہ" اسلام کی شہادت دے رہا تھا، اس کو مٹا کر "اوم" لکھا گیا، گویا ایک شہادت بدل کر دوسری شہادت پیش کی گئی، اس لئے اس پر شہادت بدلنے کا جرم عائد ہوتا ہے، حاضرین اس عجیب نکتہ آفرینی سے پھڑک اٹھے، ہیں نے کہا، ہم کو اس واسطے آپ جیسے لیڈر کی ضرورت ہے، مولانا محمد علی کا دماغ کیسا لاجواب ہے، وہ آج کی باتوں سے معلوم ہوا"

یہ تھا محمد علی کی ہمہ دانی کا عالم!

باب (۵)

جواب لاجواب

قائد کی زندگی ایراد و اعتراض سے مبرا نہیں ہوتی، اس پر اعتراضات کئے جاتے ہیں، اس سے نازک اور ٹیڑھے سوالات کئے جاتے ہیں، اس سے ناگفتنی اور پیچیدہ باتیں پوچھی جاتی ہیں، اس کی باتوں کی بال کی کھال نکالی جاتی ہے، اگر وہ ان باتوں کا برجستہ اور دو ٹوک جواب دے دے تو کامیاب ہے، اور منہ دیکھتا رہ جائے تو ناکام ہے۔

محمد علی قائد تھا، بہت بڑا قائد، اس کی زندگی بھی اعتراض کرنے والوں طنز و تعریض کے تیر برسانے والوں اور طرح طرح کے سوالات کرنے والوں کا ہدف بنی رہی، لیکن وہ کبھی خاموش نہیں ہوا، اس نے فوراً اور برجستہ جواب دیا، اور ایسا دو ٹوک کہ سائل اور معترض منہ دیکھتا رہ گیا۔

محمد علی کی زبان کبھی بند نہیں ہوتی، اس کا جواب ہمیشہ "جواب لاجواب"

ہوتا تھا، اس کا جواب سننے کے بعد پھر کسی سوال کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کسی شک و شبہ کا موقع ہی نہیں باقی رہتا تھا، اس کا جواب معترضین کو ساکت، اور سوال کرنے والوں کو خاموش کر دیتا تھا۔

پہلے کیا؟

جب ہندوستان میں نیشنلزم اور ملت پروری کی تکرار ہو رہی تھی، وطن اور مذہب میں تصادم ہو رہا تھا، وطن اور رب السموات والارض کے فرائض کی حد بندی کی جا رہی تھی، وطن قیصر تھا، اور خدا کلیسا، کہا جا رہا تھا قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو، تو بڑی سنجیدگی سے ہندوستان میں ایک سوال یہ زبان زد عام ہو رہا تھا کہ آپ سب سے پہلے کیا ہیں؟ ہندوستانی یا مسلمان؟

جو خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھ کر اس کی پرستش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے وہ بے تامل فرما دیتے تھے "ہم پہلے ہندوستانی ہیں"، جن لوگوں کی نظر

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پہ تھی، وہ فوراً کہہ دیتے تھے کہ "ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں"۔

محمد علی ایک سچا وطن پرور، اور سچا مذہب پرست تھا، اس نے اس سوال کا جواب کیا دیا؟ یہ آپ ضرور معلوم کرنا چاہتے ہوں گے:-

" ڈاکٹر محمود سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اول

بھی مسلمان، دویم بھی مسلمان، اور سویم بھی مسلمان۔ لیکن کوئی ایسا معاملہ پیش آئے، جس کا تعلق ہندوستان سے ہو تو میں اول بھی ہندوستانی، دویم بھی ہندوستانی، اور سویم بھی ہندوستانی"!

(۲۶ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

یہ بات محمد علی کے سوا کون کہہ سکتا تھا؟ سچ پوچھئے تو اُس کے سوا کسی کو یہ کہنے کا حق بھی نہیں تھا!

امیر فیصل سے ملاقات

ترکوں نے اپنے عہد حکومت میں عربوں کے ساتھ لاکھ سلوک کئے ہوں مگر عرب اُنسے ناخوش تھے، خفا تھے، اب تک یہی صورت ہے، کوئی عرب اب تک میری نظر سے نہیں گزرا جو ترکوں کو صلواتیں نہ سناتا ہو! عربوں کے دلوں میں یہ جذبہ جس نے بھی پیدا کیا ہو، بہر حال اسی جذبہ کا کرشمہ وہ بغاوت تھی، جو ترکوں کے خلاف عربی ممالک میں رونما ہوئی، حسین شریف مکہ کا خاندان اس مخالفت میں پیش پیش تھا اس لئے کہ اس کو امید تھی کہ "وحدت عرب" کا واحد فرماں روا وہی ہوگا۔

حسین کے صاحبزادے امیر فیصل (جو بادشاہ فیصل اول کے نام سے عراق کے فرماں روا بعد میں بنے) سے اطالیہ میں محمد علی کی ملاقات ہوئی، انہوں نے ترک دور حکومت اور ترکی دل و دماغ کی شکایت شروع کر دی،

محمد علی سنتے رہے، جب سب کچھ سُن چکے تو فرمایا:-

"ترکوں نے یہ سب کچھ کیا تو بھی وہ نہیں کیا، جو آپ کے باپ نے کیا، کہ اللہ تعالیٰ کی قسم کو بھی جھٹلا دیا، وہٰذا البلد الامین (قسم ہے امن والے شہر مکہ کی) اس شہر میں، جس کو خدا نے جائے امان ٹھہرایا ہے، آپ نے ہمارے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کو گرفتار، اور کافروں (انگریزوں) کے حوالہ کر دیا!"

(۱۵ر مئی ۱۹۲۵ء)

امیر فیصل اس "قول فیصل" کا جواب نہ دے سکے، نہ خود کوئی "امر فیصل" پیش فرما سکے۔

النبا، العظیم

مجلس خلافت سے جب سلطان ابن سعود نے وہ وعدے کئے تھے جن کی بنیاد پر یہ یقین تھا کہ وہ اپنی وہاں بادشاہت نہیں قائم کریں گے، مولانا ابوالکلام آزاد، صدر خلافت تھے، پھر جب سلطان نے بادشاہی کا اعلان کیا تو علی برادران کی طرف سے اس طرز عمل کی مخالفت ہونے لگی، محمد علی نے سخت مخالفانہ رویہ اختیار کیا، اس لئے کہ ان کے حاشیۂ خیال میں بادشاہ اور مُلک کا تصور ہی نہیں آسکتا۔

مولانا ابوالکلام نے "النبا، العظیم" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین

لکھا، جو لاہور کے "زمیندار" میں شائع ہوا، اور اس کے کچھ اجزاء "خلافت" بمبئی میں بھی شائع ہوئے، ان مضامین میں کچھ جملے ایسے بھی تھے، جن کے متعلق محمد علی کا یہ خیال تھا، کہ وہ ان پر حملے کے مترادف ہیں، محمد علی کا یہ بھی خیال تھا کہ انہیں مسئلہ خلافت کی اہمیت و حقیقت سے بھی ناواقف بتایا گیا ہے:۔

محمد علی کا جواب تھا:۔

"مولانا ہمارے خیالات کو مسئلہ خلافت کی حقیقت سے
ناواقفیت پر محمول فرمائیں" "تو بسر و چشم" (لیکن) اگر ہم جیسے
لوگ بھی، خلافت کی حقیقت سے ناواقف رہے تو پھر حکومتہائے
برطانیہ و ہند و مسٹر لائڈ جارج (سے) ناواقفیت کی کیا
شکایت ہو سکتی ہے؟"

یہ تھا محمد علی کا کلام بلاغت نظام!

فرط غیظ و غضب

مولانا غلام رسول مہر مدیر "انقلاب" لاہور، جب زمیندار کے اڈیٹر تھے، انہوں نے سلطان ابن سعود کی حمایت کی، اور محمد علی کی مخالفت میں متعدد مقالات لکھے، ایک مضمون میں یہ الزام لگایا کہ محمد علی مصر کے جنرل عزیز پاشا سے ملے، اور انہیں ابھارا کہ وہ سعودی عربیہ پر حملہ کر دیں، ہندوستان کے اور دنیا کے مسلمان ان کا ساتھ دیں گے۔

یہ الزام بالکل غلط تھا، محمد علی نے اس کی تردید کر دی، چونکہ الزام

نہایت سنگین تھا، اس کی تردید بھی بڑی پر زور تھی، لب و لہجہ میں کافی تیزی و تندی آ گئی تھی، محمد علی کی تردید پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے "زمیندار" میں مہر صاحب نے محمد علی کی برہمی اور "فرط غیظ و غضب" پر تعجب اور افسوس کا اظہار کیا۔

محمد علی نے کہا:۔

"اگر مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر ابھارنا کوئی
بری چیز نہیں ہے، تب تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں
اس "اتنی سی بات" پر بگڑ جانے کی معافی چاہتا ہوں، لیکن
اگر (فی نفسہٖ یہ کوئی بری چیز ہے) تو پھر ایک ایسے بے بنیاد
الزام پر "فرط غیظ و غضب" "تعجب خیز" کیوں ہے؟"

(۲۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

حالانکہ تعجب خیز تو وہ الزام تھا، نہ کہ اس کا جواب!

ڈاکٹر کچلو

آخر زمانہ میں ڈاکٹر کچلو، اور محمد علی دوست نہیں رہے تھے، دونوں میں مخالفت پیدا ہو گئی تھی، دونوں کے نظریات و خیالات میں انقلاب ہو گیا تھا، محمد علی جس راستہ پر تھے، کچلو اسے غلط سمجھتے تھے، کچلو کا راستہ محمد علی کو غلط نظر آتا تھا، محمد علی خلافت سے چمٹے ہوئے تھے، اور کچلو نے کانگرس اور مہا سبھا کے نہلے پر دہلا لگانے کے لئے "تنظیم" نامی انجمن قائم کر لی تھی۔

اندر میں فساد ہوا، مسلمان ملزمین کی پیروی کے لئے ڈاکٹر کچلو اندر گئے، لیکن حکام ریاست نے "شورش پسندی" کے الزام میں ڈاکٹر صاحب کو حدود ریاست سے خارج کر دیا، محمد علی نے شدید اختلافات کے باوجود کچلو کی طرف سے اس الزام کا مدلل جواب "ہمدرد" میں دیا:۔

"کیا کوئی ہندو بتا سکتا ہے، کہ کچلو کے "قدوم فتنہ لزوم" سے کہاں کہاں فساد ہوا؟ ایک فساد کو تو ہم جانتے ہیں اور وہ آج سے آٹھ برس پہلے جلیانوالہ باغ میں ہوا تھا اور ایک (دوسرا) فساد جیتو میں!

(۱۲- اپریل ۱۹۲۷ء)

جلیانوالہ باغ اور جیتو کے معرکوں میں ڈاکٹر کچلو ہی اصل ہیرو تھے جلیاں والا باغ نے تو وہ تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے، جسے آج بچہ بچہ جانتا ہے!

لازم و ملزوم

بعض لوگ کہا کرتے تھے، انگریزوں کا کام یہی ہے کہ لڑاؤ، اور حکومت کرو" جب تک ان کا قدم موجود ہے، ہندو مسلم سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اب بھی مع گاندھی جی کے تمام کانگرس سورماؤں اور رہنماؤں کا یہی خیال ہے۔

یہ بات محمد علی تک پہنچی، اور اس نے فوراً ہی اس بودی، اور کمزور

بات کے تار و پود بھی بکھیر دیے:۔

"آپ جو یہ کہتے ہیں کہ جب تک انگریز رہیں گے، پھوٹ رہے گی یہ میں نے مانا کہ درست ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ جب تک ہم میں پھوٹ رہے گی، اس وقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے!"

(۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

یعنی دونوں کوششیں ایک ساتھ شروع ہونی چاہئیں، انگریز اور پھوٹ دونوں کو ساتھ ساتھ "بھارت نکالا" ملنا چاہئے۔

مذہب اور سیاست!

محمد علی کے ہاں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں تھے، ان کے ہاں مذہب سب کچھ تھا، باقی جو کچھ تھا وہ اسی کا تابع تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مذہب کو کبھی "پرائیوٹ" نہ بنا سکے۔

اپنے ایک مضمون میں انہوں نے اپنے تیسرے سفر یورپ کا جو مسجد کانپور کی شہادت کے سلسلہ میں مسٹر وزیر حسن (بعد میں جسٹس، سر وزیر حسن) کے ساتھ ہوا، کچھ ذکر کیا ہے، اس کا اقتباس ذیل خاص طور پر اہم ہے:۔

"کرنل ویجوڈ (جو بعد میں کچھ عرصہ کے لئے، وزیر ہند بھی بنے تھے) نے مجھے پارلیمنٹ میں مدعو کیا تھا، ہم چار پی رہے تھے، انہوں نے فرمایا! بھائی تمہارا جو جی چاہے کرو، مگر اپنے

مذہب کو ہماری پارلیمنٹ میں نہ لاؤ! میں نے کہا میرا مذہب
پارلیمنٹ تو پارلیمنٹ آپ کے چکلوں اور شراب خانوں
تک میں جائے گا، اور وہاں کی گندگیوں تک کو دُور کریگا۔"

(۱۸۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

بیچارے کرنل ویجووڈ!
غریب نے کاہے کو ایسے 'بھیانک' اور وسیع الاختیار
مذہب کا تصور کیا ہوگا۔

برجستہ!

۱۹۲۸ء میں، علاج کی غرض سے، محمد علی ولایت جارہے تھے،
قبل اس کے کہ جہاز پر چڑھیں، ڈاکٹری معائنہ ہوا۔
بقول محمد علی:-
"بندر پر ڈاکٹر کو نبض دکھائی، اس نے پوچھا "اچھے ہو؟"
میں نے کہا، اگر اچھا ہوتا تو ولایت کیوں جاتا، باردولی
نہ گیا ہوتا۔"

(۶ر جون ۱۹۲۸ء)

باردولی میں اس وقت پٹیل صاحب نے کسانوں کی حمایت میں،
ایک محاذ قائم کر رکھا تھا، اور باقاعدہ قید و بند کا سلسلہ شروع ہو چکا
تھا۔

صدارت کا مسئلہ

علماء کرام کے ایک جلسہ میں، حسب معمول صدارت پر اختلاف پیدا
ہوا، کچھ لوگ محمد علی کا نام پیش کرنا چاہتے تھے، اور بعض دوسرے علماء کرام کا
نام نامی و اسم گرامی پیش فرمارہے تھے، عین تجاویز کے اس معرکہ کارزار میں
ایک "عالم" صاحب نے محمد علی سے درخواست کی کہ آپ خود اپنا نام واپس
لے لیجئے۔

محمد علی گویا ہوئے:-
"مجھ پر اس درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا، مگر جو حالات
پیش آئے ہیں، ان کے بعد اس جلسہ کی صدارت کرنا میں
اپنی توہین سمجھوں گا!"

یہ کہا اور اٹھ کر چلے آئے، یہ واقعہ، انہوں نے مولانا
عبدالماجد صاحب دریاآبادی کو ایک نجی خط میں بہ تفصیل تحریر فرمایا تھا
افسوس مکتوب کے بعض بڑے دلچسپ "حصص" محض "مفاد عامہ" کی خاطر
شائع نہیں کئے جاسکتے۔

باب (۶)

حسنِ بیان!

زبان و بیان پر محمد علی کو غیر معمولی قدرت تھی، باتیں کرتے کرتے یا مضمون لکھتے لکھتے، کسی موضوع پر گفتگو کرتے کرتے، کسی اہم ترین مسئلہ پر اظہار خیال کرتے کرتے، سنجیدہ سے سنجیدہ مباحث پر بحث کرتے کرتے آپ بیتی، اور جگ بیتی بیان کرتے کرتے، وہ ایسی مزیدار پُر لطف، اور خندہ آور باتیں کہہ جاتے ہیں، جو انہی کا حصہ ہے، اس معاملہ میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کہیں بھی برجستگی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی، ان کی باتوں کا لطف ان کی برجستگی میں تھا، حسن بیان نے اس میں اور چار چاند لگا دئے تھے۔

وہ پیش پا افتادہ باتیں بھی کہتے تھے، لیکن پھر بھی ان کا حسن بیان، پیش پا افتادہ باتوں کو بھی پُر کیف بنا دیتا تھا، اور یہ کیف اتنا نکھرا ہوا

ہوتا تھا کہ ادب شناس اصحاب بے ساختہ پکار اٹھتے تھے، کہ کہیں اور،

یہ حسنِ بیاں زورِ زباں ہو نہیں سکتا

شملہ کا قیام

تبادلۂ آب و ہوا کے سلسلہ میں محمد علی شملہ گئے، یہ وہ زمانہ تھا، کہ اسمبلی کا اجلاس ختم ہو چکا تھا، اور شہر کی چہل پہل ماند پڑ چکی تھی، جہاں وہ مقیم تھے، وہ بہت سنسان جگہ تھی۔

ایک مضمون میں اپنے شملہ کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرا مکان جاکو کی بلندی پر ہے، اور اس راستہ میں چند وہی ہستیاں ہیں جن کو "کونوا قردۃ خاسئین" کا حکم ملا تھا!"

(۱۱ر نومبر ۱۹۲۷ء)

اگر صرف بندر کا ذکر کر دیتے تو وہ لطف نہ آتا، جو اس قرآنی تلمیح سے پیدا ہو گیا۔

وائسرائے کی تقریر

وائسرائے نے مرکزی اسمبلی میں ایک تقریر کی، اس تقریر پر "ہمدرد" میں محمد علی نے نکتہ چینی کی، لیکن نکتہ چینی سے پیشتر اپنی صفائی ان الفاظ میں

دیتے ہیں :-

"مسدس حالی پر اعتراض کرنے والے نے اس کے پہلے ہی
مصرعہ پر اعتراض جڑنا لازمی سمجھا تھا، اور
کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا!"
پر چھوٹتے ہی اعتراض جڑ دیا تھا کہ "جا کے" کیوں پوچھا؟
ممکن ہے بقراط خود پوچھنے والے کے گھر آ گیا ہو، یا سر بازار
مل گیا ہو، (اسی طرح) میں خواہ مخواہ واشگٹن کے بیان پر
اعتراضات جڑنا نہیں چاہتا۔"

(۲۳ نومبر ۱۹۲۷ء)

کون ہے، جو اس پُر لطف تمہید، اور تمہید سے زیادہ حسن بیان کی داد
نہ دے؟

شا سے ملاقات

انگریزی کے مایۂ ناز ادیب اور انشاء پرداز جارج برنرڈ شا
سے محمد علی ایک بار ملے تھے، وہ بھی محمد علی کی ذہانت، اور برجستہ گوئی
کا قائل تھا۔

برنرڈ شا سے اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ محمد علی ان الفاظ میں کرتے ہیں:-
"برنرڈ شا نے مسلمانوں کی تنگ نظری اور تعصب کی یہ کہہ کر
شکایت کی کہ مجھے دمشق کی جامع مسجد میں کسی نے گھسنے نہ دیا

میں نے عرض کیا، غالباً بوٹ میلے ہوں گے، مولانا سید
سلیمان ندوی نے فرمایا، مسجد میں تو وہ اب بھی داخل
ہونے دیئے جائیں گے، لیکن اگر وہ اسلام میں داخل
ہو گئے تو ممکن ہے، ایک دن وہ خلیفہ بھی بنا دیئے جائیں
برنرڈ شا، اور خلیفہ! اس تصور سے بھی ہنسی آتی تھی،
اور خود شا جیسے ہنسا دینے والے ادیب نے بھی دل کھول کر
ہنسنے سے مولانا کے اس لطیفہ کی داد دی!"

(۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء)

"مستغرب"

آپ یورپ کے بہت سے ایسے فضلاء سے واقف ہوں گے،
جو مشرق کے حالات و خواص پر ریسرچ کرتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں،
مطالعہ کرتے ہیں، اور محنت کرتے ہیں، اور اپنے تئیں "مستشرق" کہلاتے
ہیں، ان میں بعض وہ ہوتے ہیں، جو واقعی، اپنے موضوع پر وسیع نظر رکھتے
ہیں، - - - - - - - - - - - - - - - - -
- - - اور بعض وہ ہوتے ہیں، جو دو چار کتابیں لکھ کر، محدود مطالعہ
اور کمزور نظر کے باوجود "مستشرق" بن جاتے ہیں۔
"مستشرق" کے جواب میں محمد علی نے ایک نئی اصطلاح "مستغرب"
کی ایجاد کی تھی، سنیئے:-

"میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مشہور انگریزی ناول نگاروں کی اتنی تصانیف پڑھی تھیں کہ جب میں انگلستان پہنچا تو وہ ملک مجھے ذرا بھی غیر مانوس نہ معلوم ہوا، میں جہاں کہیں بھی رہا اور جہاں کہیں بھی گیا میں نے لوگوں کی عادات و خصائل کا نہایت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔

اگر کوئی یورپین کسی مشرقی ملک میں ایک دو سال رہ کر، اور اس کے چند مصنفین کی تصنیفات کا مطالعہ کر کے "مستشرق" کہلا سکتا ہے، تو یقیناً میں مستغرب کہلانے کا مستحق ہوں!"

(۹ر فروری ۱۹۲۸ء)

فیشن کی ریسرچ

جب تک محمد علی "مسٹر" تھے، اگرچہ ایک فیشن ایبل جنٹلمین تھے لیکن اسلام سے بے بہرہ نہیں تھے، شعائر اسلام پر ممکن ہے عمل میں کوتاہی کبھی کبھی ہو جاتی ہو، لیکن عقیدہ اور ایمان کا جہاں تک تعلق تھا، وہ اس زمانہ میں بھی پکے مسلمان تھے۔

پھر وہ دور آیا، جب محمد علی "مولانا" بن گئے، اب وہ ایک سچے مسلمان تھے، مومن قانت تھے، اسلام کے ہر حکم پر سجدہ ریز ہر اسلامی شعار پر جبہ سا ہر بند ہی آئین و دستور کے والا و شیدا لیکن مطالعہ ان کی طبیعت

ثانیہ بن چکا تھا، وہ مطالعہ کرتے تھے، اور ہر موضوع پر گہری نظر رکھتے تھے، موضوع کے لئے یہ ضرورت نہیں تھی کہ وہ ان سے متعلق ہی ہو، متعلق ہو یا غیر متعلق وہ کسی چیز کو چھوڑتے نہیں تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں ہمہ داں تھے کسی موضوع پر، کسی مسئلہ پر، کسی مبحث پر، آپ گفتگو کیجئے، محمد علی اگر موجود ہیں تو ضرور دخل در معقولات کریں گے، شروع شروع میں آپ کو خیال ہوگا، انہیں بھلا اس موضوع سے کیا تعلق؟ لیکن، جب آپ ان کی باتیں سنیں گے تو محو ہو جائیں گے آپ کو احساس ہوگا کہ محمد علی کے ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتیں اس موضوع کی تحقیق پر صرف ہوئی ہیں، محمد علی میں یہ وسعت نظر، یہ ہمہ دانی، یہ جامعیت کیسے پیدا ہوئی؟ اسے محمد علی کی زبان سے سنئے:-

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیان"

"جنرل کارڈن کا قول ہے، اگر تم کسی ملک کے لوگوں کے صحیح خیالات سے آگاہ ہونا چاہتے ہو، تو یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تم ان کی کھال کے اندر گھس جاؤ۔

ایک کالی کھال کے انسان کے لئے، اگر یہ ممکن نہیں کہ گوری کھال میں گم ہو جائے تو کم سے کم اتنا تو کرے کہ گوری کھال والوں کے کپڑوں ہی کے اندر گھس جائے۔"

(۹ر فروری ۱۹۲۸ء)

یہ وجہ تھی کہ محمد علی یورپ کے "فیشن" کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہتے رہتے تھے، لباس کی خواہ وہ مردانہ ہو، یا زنانہ، تراش خراش، تبدیلی، ترمیم

اضافہ کی، ہر چیز ان کی نظر میں رہتی تھی، فیشن سے متعلق وہ مغرب کے رسالوں اور کتابوں، اور اخباروں کا برابر مطالعہ کیا کرتے تھے، "تاکہ کالا آدمی گوری کھال کے کپڑوں میں گھس جائے"!

اجمل خاں

ہندوستان کے رہنماؤں میں، اجمل خاں سے محمد علی کو بڑی گہری عقیدت تھی، اجمل خاں کے کردار، شخصیت، اور سیرت اور عمل سے محمد علی متاثر تھے، وہ رام پور گئے، جہاں وہ شاہی طبیب تھے، اچھے خاصے تھے، دفعتہً دل پر مرض کا حملہ ہوا، اور وہ آناً فاناً رخصت ہوگئے۔

اس حادثۂ فاجعہ پر، محمد علی کا دل خون کے آنسو رو دیا، انہوں نے اجمل خاں پر ایک طویل مضمون تحریر فرمایا، لکھتے ہیں:-

"ملک و ملت کی حالت کا آئینہ تھے، جو حالت ملک و ملت کی ہوتی، اس کا صحیح عکس، ان کے قویٰ کی کمزوری، اور قلب میں نمایاں ہوتا رہتا تھا"

(۶ر جنوری ۱۹۲۸ء)

بڑے سے بڑے مرثیہ اور ضخیم سے ضخیم کتاب میں اجمل خاں اور ملک و ملت کے اس گہرے تعلق کو نہیں واضح کیا جا سکتا تھا، جس کا آئینہ محمد علی نے دکھا دیا۔

قبر اور قصر

سلطان ابن سعود کی بادشاہت سے محمد علی بہت خفا تھے، ان کے نزدیک سلطان کا یہ وہ جرم تھا، جسے ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا تھا، جو لوگ سلطان کے حامی تھے، اور محمد علی پر طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتے تھے، محمد علی ان کا مقابلہ بھی ڈٹ کر کرتے تھے۔

جماعت اہل حدیث سے محمد علی کو توقع تھی کہ وہ چونکہ شخصیت پرست نہیں ہے، بلکہ براہ راست کتاب و سنت پر عامل ہے، اس لئے وہ ضرور بادشاہت کی مخالفت کرے گی، اور جمہوریت کی "تائید کرے گی"، لیکن، کہ

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم!

ایسا نہیں ہوا، اس جماعت نے، سب سے زیادہ سلطان کی حمایت اور محمد علی کی مخالفت کی۔

ایک موقع پر اس موضوع پر محمد علی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:-

"نیند کے متوالے وہ لوگ ہیں جو پیر پرستی سے تو بیزار ہیں مگر بادشاہ پرستی کے نشہ میں سرشار ہیں، جو قبر پرستی پر لعن کیا کرتے ہیں، مگر قصر پرستی کے لئے قصائد لکھا کرتے ہیں"

(۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۶ء)

چند بول!

لیکن وسعت معنی میں ایک پوری کتاب!

بہشت، اعراف، دوزخ!

۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا، یہ بڑا پُرفتن زمانہ تھا، مجلس خلافت، اب تک ترک موالات پر قائم تھی، کانگرس میں سوراج پارٹی موتی لال نہرو نے قائم کر لی تھی، جو "جوابی تعاون" پر عمل کر رہی تھی، ہندو مہاسبھا ہندوؤں پر چھائی ہوئی تھی۔

مرکزی اسمبلی کے لئے دہلی سے صرف ایک ہی شخص ممبر ہو سکتا ہے، شریفانہ معاہدہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ تھا کہ ایک دفعہ ہندو، اور ایک دفعہ مسلمان کھڑا ہوا کرے، اس دفعہ مسلمان کی باری تھی، مسلمانوں نے مسٹر آصف علی کو کھڑا کیا، لالہ شیو نرائن کو موتی لال کی سرپرستی حاصل تھی، اور ایک بالکل نو آموز شخص لالہ رنگ بہاری لال کو لالہ لاجپت رائے، اور ڈاکٹر مونجے، اور پنڈت مالویہ کی تائید حاصل تھی، حالانکہ اصولاً نہ مہاسبھا کو کوئی نمائندہ کھڑا کرنا چاہئے تھا، اور نہ موتی لال کو۔

بہرحال مقابلہ ہوا، اس مقابلہ کے نتیجہ پر محمد علی نے حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا:-

"یکم نومبر کی سہ پہر کو انتخاب کا نتیجہ سنا دیا گیا، لالہ رنگ بہاری لال کو ۱۸۸۰ ووٹ ملے، مسٹر آصف علی کو ۱۴۴۶، اور

لالہ شیو نرائن کو ۷۴ ــــ بہشت، اعراف، اور دوزخ تقسیم ہو چکے!"

(۳/ نومبر ۱۹۲۶ء)

جو لوگ انتخابات کے ادا شناس ہیں، وہ جانتے ہیں، جیتنے والے کے لئے "بہشت"! ناکام لیکن کامیابی سے قریب تر پہنچ جانے والے امیدوار کے لئے "اعراف"! اور بالکل ناکام کے لئے "جہنم"! کا استعمال کتنا بلیغ اور معنی خیز ہے!

"من نہ بولیدم"

ہندو مہاسبھا "ہندوؤں کی واحد نمائندہ جماعت" بنی ہوئی تھی، کانگرس اس کے سامنے بالکل سپر انگندہ ہو چکی تھی، گاندھی جی روپوش تھے، موتی لال بوکھلائے ہوئے تھے، جواہر لال خلوت گزیں تھے، مالوی جی فرمانروا تھے، ڈاکٹر مونجے حاکم با اختیار تھے، جیکر، کیلکر، اور اسی قبیل کے دوسرے اصحاب مسلمانوں کے خلاف سب کچھ کہنے کے لئے آزاد تھے۔

مسلمانوں کو اب تک علی برادران اور حکیم اجمل خاں نے روک کے رکھا تھا، جو مسلمان ڈاکٹر کچلو، اور مولانا ظفر علی خاں کی طرح میدان میں آ کر ہندوؤں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، ان کا مقابلہ کرتے تھے، اور گاندھی جی وغیرہ سے التجا کرتے تھے، کہ وہ بھی اسی طرح مہاسبھائیوں کا مقابلہ کریں، اور فضا کو سازگار کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

آخر علی برادران، اور اجمل خاں نے گاندھی جی کو ایک تار دیا، اور اُن سے آخری بار استدعا کی کہ وہ مہابھائیوں کا اژدہام کم کرنے کے لئے، میدان میں آئیں، ورنہ پھر ہم مسلمانوں کے ذمہ دار نہیں، اس تار پر مولنٰا ابو الکلام کے دستخط بھی تھے۔

جب یہ تار شائع ہوا، ہندو اخبارات نے علی برادران، اور اجمل خاں کی "فرقہ پرستی" "تنگ نظری" اور "تعصب" کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑانی شروع کردیں، مولنٰا ابو الکلام آزاد کو ہدفِ مطاعن بنایا گیا، علی برادران اور اجمل خاں نے تو یہ وار سہ لیا، لیکن مولنٰا نے پھر سکوت اختیار فرمالیا، محمد علی کو یہ ناگوار ہوا، انہوں نے اس مسئلہ پر "ہمدرد" میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا:-

"اس تار پر ان مولنٰا ابو الکلام صاحب آزاد کے بھی دستخط ثبت تھے، جو ہنود کی زیادتیوں کے بارے میں عرصے سے دہنِ مبارک پر مہرِ سکوت لگا کر ابو الکلام کی جگہ ابو السکوت بنے بیٹھے ہیں، اور جنہوں نے بقول راویانِ ثقہ کنونشن کے تماشے کے ختم ہونے پر فرمایا کہ مسلمان احمق تھے، کہ وہ کنونشن کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے آئے، اور ہندو احمق تر تھے کہ انہوں نے ایسے مطالبات تک کو قبول نہیں کیا، جس کے یقیناً یہ معنی ہیں کہ مولنٰا ابو الکلام آزاد عقلمند ترین شخص ہیں کہ بالکل خاموش رہے، اور بولے بھی تو ایک

مشہور لطیفہ کے امام کی طرح جس کے سارے مقتدی، نماز میں بول اٹھے تھے، اور جس نے بالآخر کہا کہ "شکر خدا من نہ بولیدم!"

(۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء)

کھُلی چٹھی!

مولنٰا غلام رسول مہر نے، جو اب روزنامہ "انقلاب" لاہور کے ایڈیٹر ہیں، اور پہلے روزنامہ "زمیندار" کے مدیرِ مسئول تھے، "زمیندار" میں ایک "کھلی چٹھی" محمد علی کے نام لکھی تھی، یہ چٹھی آویزش نجد و حجاز کے سلسلہ میں لکھی گئی تھی۔

محمد علی نے اس "کھلی چٹھی" کا جواب، اپنے اخبار "ہمدرد" میں دیتے ہوئے فرمایا:-

"اس کھلی چٹھی میں کوئی چیز ڈھکی ہوتی، اس کی عریانی پر تو شمشیرِ برہنہ کی تشبیہ بھی صادق نہیں آتی، اس لئے کہ عریانی کے ساتھ تلبیس بھی ہے، اور کتمان بھی، لیکن تلبیس ہے تو وہی تلبیس الحق بالباطل، اور کتمان ہے تو وہی کتمانِ حق۔

اس کھلی چٹھی کو اگر کسی چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، تو وہ یورپ کے ناچ گھروں کا لباسِ نسوانی ہے، جو لباس کا لباس

کتمان کا کتمان اور اعلان کا اعلان ہے!"

(۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء)

"اونٹ رے اونٹ"!

رفیقان راہ کی گریز پائی، سرکار کی مخالفت، قوم کی ناقدری، اور ملک کی بے حسی سے محمد علی بہت متاثر ہیں، ان کا جی چاہتا ہے، کہ وہ پبلک کو خیرباد کہہ دیں، ہنگامہ کی زندگی ترک کریں۔

اپنے اس ارادہ پر گفتگو کرتے ہوئے، محمد علی لکھتے ہیں:۔

"اونٹ رے اونٹ تری کون سی کل سیدھی ہے، ایک خرابی ہو تو اصلاح کی جائے، جب ہر طرف خرابیاں ہی خرابیاں نظر آرہی ہیں، تو ہجوم یاس سے متاثر نہ ہونا نہایت مشکل ہے، کسی سلطنت میں ایک بار کچھ اس قسم کی بارش ہوئی کہ جس پر ایک بوند بھی پڑ گئی، وہ فاترالعقل ہو گیا، کوئی کپڑے پھاڑنے لگا، کوئی لوگوں کو مارنے لگا، کوئی گالیاں بکنے لگا، کوئی ننگا ہو کر ناچنے لگا، غرضیکہ عالم وعامی، شریف، رذیل، اعلیٰ و ادنیٰ کوئی بھی اس دیوانگی سے نہ بچ سکا۔

بادشاہ اور وزیر، تخلیہ میں کچھ گفتگو کر رہے تھے، ان کو نہ اس عجیب و غریب بارش کی کچھ خبر تھی، نہ ان پر ایک چھینٹ پڑنے پائی تھی، جب وہ خلوت سے باہر نکلے تو چوبداروں

اور خدمت گاروں کو مست پایا، افسروں کو حکم دیا، کہ اس گستاخی کی خدام بارگاہ کو سزا دی جائے، تو وہ اُلٹے بادشاہ اور وزیر پر ہنسنے لگے، کوتوال کو حکم دیا کہ سب کی مشکیں کس لے، تو اس نے خود بادشاہ کو گرفتار کرنا چاہا، اعلیٰحضرت پریشان ہو کر حرم سرا میں تشریف لے گئے، کہ کچھ دیر وہیں دل بہلائیں، مگر وہاں ملکہ اور شہزادی، خواجہ سرا، اور باندیاں جس رنگ میں نظر آئیں، اس کا ذکر کرنے سے، بقول، بعض ادویہ کا اشتہار دینے والوں کے "تہذیب مانع ہے"۔

بادشاہ اُلٹے پاؤں زنانہ سے مردانے میں آئے، اور وزیر باتدبیر سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کیا جائے؟ اس نے کچھ دیر تامل کیا پھر کہا، جہاں پناہ مجھے بارش کا پانی پینے کا بہت شوق ہے، میرے گھر میں پرنالے کے نیچے دو گھڑے بھرے رکھے ہیں، ایک حضور سر پر ڈال لیں، ایک میں ڈال لوں پھر ہم بھی ان ہی سب کی طرح ہو جائیں گے، پھر ہمیں کوئی بھی دیوانہ نظر نہ آئے گا، ایک حمام میں سب ہی ننگے۔

بعض وقت یہی جی میں آتا ہے کہ چھوڑو سارے دھندے قصر حکومت کی دہلیز پہ جبہ سائی کرو، اور گورنری نہ سہی، تو انگزیکٹیو کونسلری ہی سہی، اور وہ بھی نہیں، تو ایک

منسٹری ہی لے مرد۔

ہندو مسلم اتحاد کیسا؟ تم بھی بے پھاگن کے ہولی کھیلو، گالیاں یوں ہی کھاتے ہو، خود بھی دینے لگو، کیسی کانگرس اور کس کا سوراج، کیسا چرخہ اور کہاں کا کھدّر؟ سب پر لعنت بھیجو!"

(۳۰ جنوری ۱۹۲۷ء)

بوڑھا جوان!

علی گڑھ کالج سے محمد علی کو ہمیشہ شیفتگی رہی، وہ اس کی اصلاح کی فکر سے کبھی غافل نہیں ہوئے، نواب محسن الملک مرحوم اس کے سکریٹری تھے، انہیں ایک گرما گرم خط لکھ دیا، اور کالج کے ٹرسٹیوں کا پول کھول دیا۔

نواب صاحب نے انہیں لکھا، تم ابھی نوجوان ہو، تم میں جوش زیادہ ہے۔

محمد علی نے یہ الزام تسلیم کر لیا، اور نواب صاحب کو جواب دیا:۔

"آپ کا خیال ہے کہ میں جوش میں لوکل ٹرسٹیوں کے خلاف بہت کچھ لکھ جاتا ہوں، آپ جانتے ہیں، جوانی دیوانی، اس عمر میں اگر جوش نہ ہوگا تو کیا باسی کڑھی میں اپھان گرے گا، مجھے تو آپ کے جوش پر رشک ہے، کہ اس عمر تک جوانی برقرار ہے، خدا عمر خضر عطا فرمائے۔ (۶ جولائی ۱۹۰۹ء)

بوڑھے نوجوان کے نام، نوجوان بوڑھے کا خط!

محسن الملک بڑھاپے میں بھی جوان تھے، اور محمد علی نوجوانی میں بھی بڈھوں کی طرح پختہ کار! ہوشیار کارگزار!

دلچسپ خط

میر محفوظ علی بدایونی سے محمد علی کے بڑے گہرے روابط تھے، انہوں نے ایک دفعہ محمد علی کو تیز و تند سخت لہجہ میں خط لکھا، کہ اخبار نہیں ملتا!"

محمد علی نے جواب دیا:۔

"ڈاکیہ اخبار چرا لے، اور تو مجھے گالیاں دے، خیر
مزا لینے والے مزے لے رہے ہیں

(۴ مارچ ۱۹۱۱ء)

دلچسپ نظارہ!

۱۹۲۸ء میں محمد علی علاج کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تھے، کچھ روز پیرس میں بھی قیام رہا، وہاں، ایک پرانے دوست عبدالولی خاں سے ملاقات ہوئی۔

ملاقات کی کیفیت ملاحظہ ہو:۔

"پرسوں شام کو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں، قاضی عبدالولی خاں

مع دو صاحبزادیوں کے جو نہایت حسینہ اور جمیلہ تھیں، تشریف رکھتے ہیں، ان میں سے ایک مسلمان تھی، دوسری کو وہ نیم مسلمان نیم کافر کہتے ہیں، مگر شاعروں کی اصطلاح میں دونوں کافر ہیں، اور فقہا کی اصطلاح میں "عین حیات" ہیں۔

ایک امریکن ہے، دوسری آسٹرین جرمن!"

رنگین بیانی، شگفتہ نگاری، خوش گفتاری، محمد علی کا حصہ تھا۔

پُرلطف مشورہ

لندن میں محمد علی نے علاج شروع کر دیا، ذیابطیس کا بہترین علاج فاقہ سے ہوتا ہے، محمد علی کو بھی فاقہ کرایا گیا، فائدہ ہوا۔

اپنے بے انتہا عزیز دوست، مولانا عبد الماجد دریا بادی کو ایک خط میں لندن سے لکھتے ہیں:-

"میں شوکت صاحب کو بھی لکھنے والا ہوں، وہ بھی اب پھلوں پر گزارہ کیا کریں، اور جس طرح میں ورزشوں میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں، وہ بھی لیا کریں۔

میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے، کمر چار انچ کم ہو گئی ہے ان کا (شوکت صاحب کا) وزن تو یقیناً ۲۰-۲۵ سیر گھٹ جائے گا، اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں،

کمر پتلی اور صراحی دار گردن

کے مصداق ہو جائیں گے!"

کمر پتلی اور صراحی دار گردن

کے ساتھ شوکت صاحب کے بھاری بھرکم جسم کا تصور کیجئے، عجیب جنت نگاہ منظر آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔

محمد علی، شوکت صاحب کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے، ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے، لیکن، محمد علی کے فقروں سے وہ بھی نہیں بچ سکتے تھے!

گوہر جان!

نغمہ و موسیقی سے محمد علی کو بڑا لگاؤ تھا، لیکن قوم کے نوحہ و ماتم نے انہیں نغمہ و موسیقی سے بے نیاز کر دیا تھا۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"ہندوستانی گانا سننے کو اب بھی دل تڑپا کرتا ہے، گوہر جان کی طرف سے شوکت صاحب دعوت لائے تھے، کبھی تو کچھ سن لیا کیجئے، میں قسم کھاتی ہوں، سوا اقبال کے اشعار، اور حسرت کی غزلوں کے کچھ نہ سناؤں گی۔

میں نے کہلا بھیجا، اب معذور ہوں، البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں، تو پیارے صاحب کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں

(اس طرح) جنت نگاہ نہ سہی "فردوس گوش" ضرور
حاصل ہو جایا کرتی ہے!"

محمد علی اپنی کوئی بات چھپاتے نہیں تھے، بلکہ مزے لے کر خود بیان بھی کرتے تھے۔

باب (۷)

شوخیٔ گفتار

شوخیٔ گفتار، محمد علی کا خاص جوہر تھا، یہ وصف ان کی رگ رگ میں رچا ہوا تھا، شوخی، (ابتذال، اور پھکڑ پن نہیں) محمد علی کو بہت بھاتی تھی، وہ عملہ میں چھانٹ چھانٹ کر ایسے آدمی رکھنا چاہتے تھے، جو شوخ نگار ہوں، جن کی تحریروں میں، شوخی کا امتزاج ہو۔

مجھے یاد ہے، میں نے ابھی کچھ دن ہوئے "ہمدرد" کے تمام فائلوں کی ورق گردانی کی، اس سلسلہ میں ایک اشتہار نظر سے گزرا، یہ محمد علی کی طرف سے معاون مدیر کی ضرورت کا اظہار تھا، پہلی صفت مطلوبہ یہ تھی، کہ اس کی تحریر میں شوخی کی چاشنی موجود ہو۔

جس معیار کے محمد علی قدر دان تھے، خود اس معیار کا جیتا جاگتا نمونہ تھے، تقریر ہو یا تحریر، شوخی محمد علی کی خاص خصوصیت تھی۔

مجلس اقوام

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں نے "مجلس اقوام" قائم کی جس میں کمزور اقوام کے لئے "صبر جمیل" کی دعا کی جاتی تھی، اور زور آور اقوام کو وہ سب کچھ دے دیا جاتا تھا، جو وہ چاہتی تھیں۔

اپنے ایک مضمون میں لیگ آف نیشن یا مجلس اقوام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"موجودہ نام نہاد لیگ آف نیشن کو میں THEIUES SUPPER. یا چوروں کی دعوت بھی کہتا ہوں، جس میں کوشش کی جاتی ہے، کہ چوروں میں سر پھٹول ہوئے بغیر مال مسروقہ تقسیم ہو جائے"!

(۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۶ء)

دلچسپ حلف

اسمبلی میں ہر ممبر کو خواہ وہ کانگرسی ہو یا مہاسبھائی، کسی مذہب، عقیدہ، اصول کا پیرو کیوں نہ ہو، ملک معظم کا حلف وفاداری اٹھانا پڑتا ہے۔

یہ چیز محمد علی کے اصول کے خلاف تھی، ایک موقع پر اسی مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوئے، اور اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"(میں) تارک موالات ہوں، حکومت کی بے وفائی بد وفاداری کا حلف نہ اٹھانے کا حلف اٹھا چکا ہوں۔"

(۱۹ر جنوری ۱۹۲۷ء)

ہمدرد

نظر بندی کے زمانہ میں محمد علی کو بہت سے اخبارات، اور رسالے "ہمدرد" کے معاصرانہ تعلقات کی بنا پر تبادلہ میں پہنچا کرتے تھے، اگر کوئی شخص انہیں "سابق" ایڈیٹر ہمدرد کہہ دیتا یا لکھ دیتا، اس سے خفا ہو جاتے کہ ہمدرد و کامریڈ بھی شہید راہ حق و صداقت ہیں، پھر "سابق" کا کیا مطلب؟ اس پر انہیں بہت اصرار تھا!

مولنا سید سلیمان ندوی کو اپنے ایک نجی خط میں محمد علی لکھتے ہیں:۔

"معارف، تبادلہ کی مد میں مثل اور بے شمار اخباروں کے جاری رہے گا، تبادلہ میں نہ اس وقت "کامریڈ" آسکتا ہے نہ "ہمدرد" مگر یہ اخبار بند نہیں ہیں، وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ۔ اسی لئے جو کوئی مجھے سابق ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد لکھتا ہے، اس سے الجھ پڑتا ہوں!"

(۱۳ر جولائی ۱۹۱۷ء)

انوکھی معذرت

مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی کو خط لکھتے ہیں، اور معذرت پیش کرتے ہیں کہ خط لکھنے میں تاخیر ہوئی، یہ انوکھی معذرت دلچسپ الفاظ

میں خود انہی کی زبان سے سُنئے :-

"یہ تو امرِ مسلّم ہے کہ ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف، اپنے سالے کی تیمارداری میں ایسا منہمک ہوگیا، اور ایسا منہمک ہونا پڑا، کہ آپ کو ایک کارڈ بھی نہ لکھ سکا!"

(۱۰ر نومبر ۱۹۱۶ء)

مرض یا علاج؟

محمد علی کو ہندوستان کے اُن صوفیوں، اور ولیوں سے بڑی عقیدت تھی، جنہوں نے ہندوستان کے کفرستان میں قدم رکھا اور اپنی روحانی قوت سے کفر اور شرک کی بنیادیں ہلا دیں۔

۱۹۲۰ء میں، وہ علاج کے لئے یورپ گئے، سب سے پہلے اجمیر حاضر ہوئے، مولنا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :-

"۲۶ رمئی کی صبح کو اجمیر شریف پہنچا، تاکہ جسمانی علاج سے پیشتر کچھ روحانی علاج بھی کرسکوں، نہ معلوم ظفرالملک صاحب کی "وہابیت" زیارتِ قبور کو کہاں تک روحانی علاج سمجھے؟ اور کہاں تک خود اسے مرض تصور کرے؟"

(۶ر جون ۱۹۲۰ء)

مولنا ظفرالملک کی سخت مزاجی اور درشتیٔ طبع پر وہ اکثر چوٹ کیا کرتے تھے

جھگڑالو دوست!

میر محفوظ علی بدایونی سے محمد علی کو بڑی محبت تھی، وہ بار بار اُنہیں کھینچتے تھے، بلاتے تھے، پکڑتے تھے، وہ چاہتے تھے، میرے لئے میر محفوظ علی صاحب کے "جملہ حقوق محفوظ" ہو جائیں، لیکن میر صاحب ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی عذر کرکے اپنا دامن چھڑا لیتے تھے، یہ معذرت زیادہ تر مقدمہ بازی کی وجہ سے ہوتی تھی۔

محمد علی چاہتے تھے، میر صاحب ان الجھنوں سے آزاد ہوکر آئیں، اور ہمدرد کو سنبھال لیں، میر صاحب کو کہنا تھا، مقدمات سے نجات ملے، تو آؤں، اب محمد علی، میر صاحب کو بہت جھگڑالو سمجھنے لگے تھے، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ کی مقدمہ بازی، اور عیال داری کی مشکلات، وقت پہ کلکتہ نہ پہنچ سکنا، اور پھر عذرِ گناہ کی طول طویل داستان پڑھ کر میں نے یہ مختصر نتیجہ نکالا کہ باوجود سید ہونے کے آپ سخت ضدی ہیں، اور ان جھگڑوں کو باغ فدک کی نزاع سے کم نہیں سمجھتے!"

(۹ر اگست ۱۹۱۲ء)

پھر تقاضہ!

میر صاحب اپنی وضع پر اڑے ہوئے تھے، محمد علی اپنی روش پر قائم تھے، وہ آتے نہیں تھے، اور یہ بلائے جاتے تھے، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، دونوں میں شکوہ شکایت اور راز و نیاز کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایک خط میں جھلا کر، میر محفوظ علی کو محمد علی نے لکھا:۔

"تم نے جو مجھ کو خدا، اور رسول کے واسطے دئے ہیں، میں نے مان لیا کہ تمہارا کہنا سچا اور مجبوری واقعی تھی، لیکن اب میں انہیں واسطوں کو دوہراتا ہوں کہ خدا کے لئے، رسول کیلئے اب نہ رکو، ورنہ یہ ہوگا

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

اگر ستمبر کی ایک تاریخ بھی بدایوں کی نذر ہوئی، تو بجائے "ہمدرد" نکالنے کے میرا جنازہ نکالنا!

۳۰ر اگست ۱۹۱۲ء

پھاٹک!

محمد علی ذیابیطس کے پرانے مریض تھے، جانتے تھے کتنا خطرناک

مرض ہے، لیکن اس خطرہ کا بیان جب وہ کرتے ہیں تو ایک پُرلطف واقعہ معلوم ہوتا ہے، آپ بھی سنئے!:۔

"ایک ذیابیطسی کے لئے ایک چیونٹی کے کانٹے اور کھال میں سرسوزن سے باریک تر چھید ہو جانے سے ملک الموت کیلئے پھاٹک کھل جاتا ہے!"

حقیقت کو اس طرح بیان کرنا کہ مبالغہ معلوم ہو، اور مبالغہ کو حقیقت کا لباس پہنا دینا، حسن بیان، شوخیٔ گفتار، اور فصاحت و بلاغت کا کمال ہے اور کون کہہ سکتا ہے، محمد علی ایک بہترین ادیب اور انشاپرداز نہیں تھے۔

"سچ ناک"

گنبد خضرا پر جب بمباری کی افواہ مشہور ہوئی، تو لاہور کے سید حبیب صاحب نے اپنے اخبار "سیاست" میں اس خبر کا ذکر کیا، اور کہیں اس گولہ باری کو "ہولناک" بتایا تھا، کہیں "خوفناک"، کہیں "دردناک"، کہیں "المناک"۔

محمد علی نے "سیاست" کی اس "افسوسناک" روش پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"افسوس ان خبروں میں سے "سچ ناک" ایک بھی نہ نکلی، اور جتنی نکلیں، "جھوٹ ناک" نکلیں، "لغوناک" نکلیں، "افتراناک" نکلیں!"

(۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

امیر علی!

آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں، کچھ روز تک یہ صورت رہی، کہ حرمین شریفین پر سلطان ابن سعود کا قبضہ تھا، اور جدہ پر امیر علی (ابن شریف حسین) کا پرچم لہرا رہا تھا۔

خلافت کمیٹی نے ایک وفد بھیجا تھا جو جدہ میں رکا ہوا تھا، وفد ابن سعود سے ملنا چاہتا تھا، لیکن امیر علی حائل تھا، ایک روز امیر علی، رات کی گفتگو میں اس پر تیار ہو گیا کہ وفد کو جدہ سے آگے بڑھ جانے دے اس نے کہا کہ تم سب ممبران وفد ابن سعود سے مل آؤ، پھر مجھے اور ابن سعود کو ایک ایک پلڑے میں رکھ کر تولنا، وفد تو خود بھی یہی چاہتا تھا، صبح ہوئی تو پھر بعض مصالح کے ماتحت امیر علی نے اجازت دینے سے وفد کو انکار کر دیا۔

بقول محمد علی کے:۔

"مگر جب صبح ہوئی تو وفد کے ہاتھ میں ایک پڑق۔"

(۳۰ نومبر سنہ ۱۹۲۵ء)

سید رشید رضا!

حجاز کے موتمر عالم اسلام میں، سید رشید رضا صاحب ایڈیٹر "المنار" مصر بھی شریک تھے، محمد علی کو ان سے شدید اختلاف تھے، عرب میں ممبر کو "عضو" کہتے ہیں، سلطان رشید رضا صاحب پر بہت مہربان تھے، اور انہیں خاص

ممبر بنایا تھا۔

محمد علی کا خامۂ بہار آفریں لکھتا ہے:۔

"موتمر اسلامی میں منجملہ اور نامزدگان سلطان ابن سعود کے سید رشید رضا صاحب مالک و مدیر "المنار" بھی تھے، ان کی شان امتیاز قائم رکھنے کے لئے سلطان نجد نے انہیں بجائے مصر یا عسیر یا شام سے نامزد کرنے کے "عضو مخصوص" کا لقب مرحمت فرمایا تھا!"

(۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء)

پھر آگے چل کر اس مضمون میں سید صاحب کا مزید ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"سید رشید رضا" صاحب "عضو مخصوص" سے زیادہ کوئی امتیاز نہ حاصل کر سکے!

فہرست!

اسی مضمون میں محمد علی نے ان بدقسمتوں کی ایک فہرست پیش کی ہے جن کے سید رشید رضا صاحب بڑے گہرے دوست تھے، جن میں سے کسی سے بادشاہت چھین گئی تھی، کوئی ڈوب گیا، کوئی تباہ و برباد ہو گیا، اب فہرست ملاحظہ ہو:۔

"خدیو مصر حلمی آپ کے دوست تھے، لارڈ کچنر آپ کے دوست

تھے، سلطان ابن سعود آپ کے دوست ہیں، بظاہر؛ ؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

(۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء)

انگریز جاسوس!

علی برادران کی نقل و حرکت پر ظاہری پابندیاں تو نہیں تھیں، ہندوستان جہاں چاہیں جا آ سکتے تھے، لیکن حکومت کے جاسوس اور خبر رساں ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کیا کرتے تھے، ان کی تقریروں کی رپورٹیں بھی مرتب کرکے وہ حکام بالا کے پاس بھیجا کرتے تھے، جس مجمع میں محمد علی موجود ہوں، ناممکن تھا، کہ وہاں کوئی باقاعدہ یا بے قاعدہ "جاسوس" نہ ہو۔

یورپ سے علاج کرا کے محمد علی واپس آ چکے ہیں! ہمدرد پورٹ نے ایک ہنگامۂ کارزار برپا کر رکھا ہے، جسم اب بھی زار و نزار ہے، لیکن دل کی چونچالی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

بہار میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت محمد علی کو تفویض کی گئی، انہوں نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

"سوال یہ ہے کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے دل کی سنیں؛
یا یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے دل کی سناؤں؟ بہر حال میں
خداوند کریم کو، اور انگریزی جاسوس کو حاضر و ناظر جان کر
عرض کرتا ہوں ـــــ!"

(۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء)

محمد علی کے منہ سے یہ چند بول نکلے، اور مجمع ان کی طرف کھنچ آیا!

جسٹس دلیپ سنگھ

"رنگیلا رسول" لکھنے والا ہائی کورٹ سے بری کر دیا گیا، مسلمانوں میں ہیجان برپا ہو گیا، بعض اخبارات نے مطالبہ کیا، "جسٹس دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ" گرفتاری اور توہین عدالت اور مقدمات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا محمد علی، قصور قاضی کا نہیں، قانون کا سمجھتے تھے، ان کی رائے تھی، کہ قانون بدلوایا جائے، لیکن شروع میں ان کی رائے کے حامی بہت کم تھے، پھر بھی محمد علی اپنا پیام برابر پہنچاتے رہتے تھے۔

زیادہ شورش پنجاب میں تھی، کیونکہ وہیں قضیہ ہوا تھا، محمد علی کی مخالفت اس وقت زیادہ تر پنجاب ہی میں ہو رہی تھی، کیونکہ وہ وہاں کی بظاہر ایک بہت مقبول عام تحریک کی مخالفت کر رہے تھے، اس زمانہ میں محمد علی کے ایک عزیز دوست میر غلام بھیک صاحب نیرنگ وکیل انبالہ نے انہیں ایک خط بھیجا:۔

"خدا کے لئے آپ مقدمہ راجپال کی بحث کو، اور ہر ایسے مضمون کو جو اس بحث سے لفظاً یا معناً ظاہراً یا باطناً صراحتہً یا اشارۃً یا کنایۃً بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق قریب یا بعید، حقیقی یا فرضی یا وہمی، اصلی یا مصنوعی رکھتا ہو، بند اور قطعاً بند کر دیجئے!"

محمد علی نے اس مکتوب کا جواب باصواب میرنیرنگ صاحب کو یہ دیا:-

" نوازش نامہ ابھی ملا ، ابتدائی فقرہ پڑھا تو خدا کا واسطہ بھی نظر آیا ، اس نے مجبور کر دیا کہ جب تک آپ کی اور پنجاب کی اصلاح نہ ہو جائے لکھے جاؤں ۔

برادرم! یہ سوچا ہوتا کہ دیوانہ را ہوئے بس است ، آپ سر محمد شفیع کا واسطہ دیتے ، سر فضل حسین کا واسطہ دیتے روادہ البخاری کا واسطہ دیتے ، سر ذوالفقار علی خاں کا واسطہ دیتے ، ڈاکٹر اقبال کا واسطہ دیتے ، چودھری افضل حق کا واسطہ دیتے ، غازی عبدالرحمٰن کا واسطہ دیتے ، حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا واسطہ دیتے ، زمیندار کا واسطہ دیتے ، انقلاب کا واسطہ دیتے تو میں ہر ایسے مضمون کو جو توہین رسول اکرمؐ کی انسدادی تدابیر سے لفظاً یا معناً صراحۃً یا بداہۃً ، اشارۃً یا کنایۃً ، بالواسطہ یا بلا واسطہ ، قریبی یا بعیدی ، حقیقی یا فرضی ، واقعی یا وہمی ، اصلی یا مصنوعی ، منصفانہ یا مشتبانہ ، تعاونی یا عدم تعاونی ، ہندو سبھائی یا مسلم لیگی ، سنگھٹنی یا تنظیمی ، سوراجی یا جوابی تعاونی ، پنجابی یا دیسی ، ایشیائی یا یورپی ، مشرقی یا مغربی ، حامی یا سامی ، یافثی ، غرض کسی قسم ، نوع ، بھانت ، وضع ، طریقہ ، یا انداز کا تعلق رکھتا تو اس کو " بند اور

قطعاً بند " کر دیتا ۔

مگر (........ صاحب) غریب پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں ، اور آپ ساری خدائی کو چھوڑ کر ایک خدا کا واسطہ دے رہے ہیں کہ ان کو گمراہ کرنے دو ، میرا قیاس ہے کہ آپ نہ خدا کو جانتے ہیں ، نہ محمد علی کو!"

(۵ اگست ۱۹۲۷ء)

المرحق!

الحق مرٌ یعنی سچ کڑوا ہوتا ہے ، آپ نے بارہا سنا ہوگا ، لیکن مولانا ظفر الملک صاحب علوی ، مدیر " الناظر " کے بارے میں محمد علی کا خیال تھا ، کہ وہ " المرحق " پر عامل ہیں ، یعنی ان کے نزدیک سچ کڑوا نہیں ہوتا ، بلکہ ہر کڑواہٹ سچ ہوتی ہے ، کڑواہٹ کا دوسرا نام سچ ہے ۔

ایک وہ بھی زمانہ آیا کہ ظفر الملک صاحب ان احرار پنجاب کے شریک کار ہو گئے ، جن کی وہ ہمیشہ مخالفت کرتے رہے تھے ، صرف یہی نہیں ، بلکہ علی برادران کے خلاف عملی سرگرمیاں بھی شروع کر دیں ۔

لکھنؤ کی خلافت کانفرنس میں احرار پنجاب نہیں شریک ہوئے ، ان کی قائم مقامی مولانا ظفر الملک صاحب نے کی تھی ، محمد علی لکھتے ہیں :-

" اس مرتبہ پنجابی ٹولی کا کارواں تو لکھنؤ نہیں آیا ، مگر گرد کارواں ضرور وہاں تک پہنچ گئی ، اور اس اڑتی ہوئی گرد کو سمٹیاں

بھر بھر کر مرکزی کمیٹی پر پھینکنے والے "الحق" والے بھائی ظفر الملک صاحب علوی تھے!"

(۳ مارچ ۱۹۲۷ء)

"بس مر" کے جواب میں "الحق"، محمد علی کی کتنی انوکھی اور پیاری ایجاد ہے!

باب (۸)

جدّتِ تشبیہ

محمد علی میں ذہانت کوٹ کوٹ کے بھری تھی، نظر بڑی وسیع تھی، خیالات بڑے اونچے تھے، ان کی تشبیہیں بھی بڑی اچھوتی اور نرالی ہوتی تھیں، ان میں جدّت ہوتی تھی، تنوع ہوتا تھا، نرالاپن پایا جاتا تھا۔

ان کی تشبیہ میں الفاظ کہیں کہیں سخت ہو جاتے ہیں، باایں ہمہ شوخی، اور شگفتگی نہ صرف قائم رہتی ہے، بلکہ اور اس میں کسی حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔

اصل امتیاز

رنگ، نسل، ملک کے امتیاز کو محمد علی نہیں مانتے تھے، وہ اس امتیاز کو مانتے تھے، جو اختیاری ہو، جسے خدا کا بنایا ہوا ہر انسان حاصل کر سکتا ہو،

اور وہ امتیاز نہ رنگ کا ہو سکتا ہے، — اس لئے کہ انسان اپنا رنگ ماں کے پیٹ سے لاتا ہے — نہ وہ امتیاز نسل کا ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کوئی اختیاری چیز نہیں ہے، وہ امتیاز ملک کا بھی نہیں ہو سکتا، کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، کہ وہ فلاں ملک میں پیدا ہو؛ بس میں صرف ایک چیز ہے کہ انسان وہ امتیاز حاصل کرے، جو عقیدہ پر مبنی ہوتا ہے، ہر انسان کے اختیار میں ہے چاہے سیدھے راستے پر چلے یا غلط راستے پر۔

"نسل، ملک، رنگت وغیرہ کے امتیازات گھوڑوں؛ اور کتوں کے لئے ہیں، انسان کے لئے صرف ایک امتیاز ہے جو عقیدہ کی بنا پر ہے!"

(۱۳ مئی ۱۹۲۵ء)

ایشاٹک بل!

مرکزی اسمبلی میں ایشیاٹک بل پر (جو جنوبی افریقہ میں پیش تھا، اور جس کی تقریباً وہی نوعیت تھی جو آج پیگنگ بل کی ہے) جو مباحثہ ہوا تھا، اسے سننے، محمد علی بھی تشریف لے گئے تھے،

سر فضل حسین، اور ان کے محکمہ کے سکریٹری، سر جوزف بھور پر سوالات کی بوچھار ہو رہی تھی، مگر یہ اپنی آئیں بائیں شائیں کر کے رفت گزشت کر دینا چاہتے تھے۔

محمد علی کے تاثرات:-

"میرے سامنے ہر طرف سے ان (سر فضل حسین اور سر جوزف بھور) پر سوالات کی بوچھار ہو رہی تھی، مگر وہ نہایت ہوشیاری سے بغیر کچھ بولے جواب دے دیتے تھے، اور جس طرح شکاری کتوں سے پیچھا چھڑا کر لومڑی اپنے غار میں چھپ جاتی ہے، اسی طرح (یہ بھی) صاف بچ کر نکل گئے!"

سائمن کمیشن

محمد علی کو اس کمیشن کی تشکیل سے اختلاف تھا وہ یہ حق حکومت کو نہیں دینا چاہتے تھے، کہ وہ فیصلہ کرے کہ ہم اصلاحات کے مستحق ہیں یا نہیں؟ ان کا خیال تھا، یہ حق صرف ہندوستانیوں کا ہے کہ وہ بیٹھیں اور اپنا ایک دستور مرتب کریں۔

اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:-

"ہمارے آقا اور مولا ہم سے تعاون کے طلب گار ہیں، وہ بہ نفس نفیس، اور بلا شرکت غیرے اس کا فیصلہ کرنے بیٹھیں گے کہ قدم آگے کو بڑھایا جائے یا پیچھے کو ہٹایا جائے؛ اور اگر آگے کو بڑھایا جائے تب بھی ایک مستعد اور مضبوط جوان مرد کی طرح لانبا قدم ہو، یا اس چینی عورت کی طرح کا، جس کے پاؤں لڑکپن ہی میں آہنی شکنجہ میں کس دیے جاتے تھے، کہ وہ گھر سے نہ نکل سکے اور

کسی چہار دیواری میں مقید رہے، جس میں اس کا خاوند اور خداوند اس کو رکھنا چاہتا ہے!"

(۱۴ نومبر ۱۹۲۶ء)

مسز بسنٹ کا مسودہ

مسز بسنٹ "دولت مشترکہ ہند" کا ایک دستور اساسی تیار کر کے ولایت تشریف لے گئیں کہ وہاں اپنے بعض دوستوں کی مدد سے اسے پارلیمنٹ میں پیش کرائیں، نظر ثانی اور مشورہ کی درخواست محمد علی سے بھی کی گئی، انہوں نے یہ استدعا نہیں مانی، اور صاف انکار کر دیا، ہمدرد میں لکھا:-

"آج مسز بسنٹ دولت مشترکہ ہند کے قانون کا مسودہ لے کر ولایت گئی ہیں جس کا حشر معلوم ہے، کہ کیا ہو گا؟ اسے ایسے شخص کے سپرد کر دیا گیا، جو پارلیمنٹ کے مسودات قانون کی غلطیاں درست کرتا ہے، اس کی مثال تو بعینہٖ اس شخص کی سی ہے، جو راستہ میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا تھا، لوگوں نے پوچھا کیا تلاش کرتے ہو؟ کہا کہ بھائی ایک نعل مل گیا ہے، تین اور اسی طرح مل جائیں تو گھوڑا خرید لوں۔

گویا مسودہ قانون میں صرف نحو کی غلطیاں نہ رہیں گی تو مسودہ

ضرور فوراً پاس ہو جائے گا"۔

(۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

کتنی برمحل، اور حقیقت پسندانہ نکتہ چینی تھی، آخر کار واقعات نے بھی اس کی تصدیق کر دی!

نیشنل یونین

پنڈت موتی لال نے ابو الکلام کی اعانت سے ایک نئی انجمن "نیشنل یونین" قائم کی تھی، اس میں صرف وہی شخص شریک ہو سکتا تھا، جو کسی فرقہ وارانہ جماعت (کسی سے "اشارہ تھا مہا سبھا اور خلافت کمیٹی کی طرف) کا ممبر نہ ہو۔

محمد علی اتنے بڑے نیشنلسٹ تو کبھی بھی نہ ہوئے تھے، کہ اتنی بڑی مداہنت پر آمادہ ہو جاتے، انہوں نے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کی، چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے، اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازہ پر کندہ ہے، جو شخص اس میں داخل ہو، امید کو باہر چھوڑ آئے۔

پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی، جس کے دروازہ پر کندہ ہو

کہ جو اس میں داخل ہونا چاہے وہ ملت و مذہب کو باہر
چھوڑ آئے!"

(۶ر اکتوبر ۱۹۲۶ء)

تقسیم بنگالہ

پہلی تقسیم بنگالہ جس نے ہندوؤں کو دہشت انگیز اور انقلابی بنا دیا تھا، اور جس نے حکومت کے "طے شدہ" فیصلہ کو بالآخر بدلوا کر چھوڑا تھا، محمد علی کی نظر میں کیا تھی؟ سنئے:-

"حقیقۃً پہلی تقسیم بنگالہ اس (VIVASECTION) سے مشابہ تھی، جو یورپ کے ڈاکٹر جیتے جاگتے حیوان کو زخم لگا کر، ان کی تکلیف کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے عمل میں لایا کرتے ہیں۔

بنگال چیخ اٹھا، اور اس کے ساتھ کانگریس بھی، جس میں اس وقت تک تمام تر ہندو ہی تھے، چیخ اٹھی!"

(۱۲ر جنوری ۱۹۲۷ء)

ذاتی مصائب!

اپنے محبوب دوست مولٰنا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"قومی مصیبتوں نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل لیا ہے، جس طرح موسیٰ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا!"

(۱۴ر اپریل ۱۹۲۶ء)

باب (9)

رعایتِ لفظی

محمد علی کی انشا پردازی اور خوش گفتاری کا ایک اہم جزو، اور نہایت خوبصورت عنصر "رعایت لفظی" بھی تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے شعراء رعایت لفظی کے ماہر تھے، یہ وہ فن ہے، جو تحریر و تقریر میں اگر خوبی کے ساتھ استعمال کیا جائے، تو ایک خاص حسن اور کشش پیدا کر دیتا ہے، متاخرین کے دورِ آخر میں رعایت لفظی کا شوق جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا، اور رعایت لفظی ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ گئی تھی، جو ادب کے دامن پر حسن کے بجائے ایک بدنما دھبہ بن کر رہ گئی تھی۔

رعایت لفظی کا استعمال اگر صحیح طور پر کیا جائے تو اس کا لطف "فردوس گوش" سے کم سننے والوں کے لئے نہیں ہوتا۔

محمد علی کے ہاں یہ صنعت بہت ملے گی، اور کہیں گراں نہیں گزرے گی اور یہی اس صنعت کے استعمال کا اصل حسن ہے، سننے والا اور پڑھنے والا اگر یہ محسوس کرے کہ رعایت لفظی کی صنعت "برائے صنعت" استعمال کی گئی ہے، تو اس کا لطف جاتا رہتا ہے، اور اگر صورت یہ ہو کہ آپ "پڑھتے" یا سنتے چلے جائیں، اور ایک لطیف و خوشگوار، جاذبیت بیان، اور حسن ادا رعایت لفظی کے روپ میں، آپ کی نگاہ، اور سماعت کو اپنی طرف متوجہ کر لے، تو بس، لکھنے والا، یا کہنے والا اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، محمد علی کی انشا پردازی اور خوش گفتاری کی یہی خصوصیت تھی۔

شریف بے شرف

شریف حسین (والئے مکہ) نے خلیفۃ المسلمین کے خلاف جس طرح بغاوت کی، ترکی حکومت سے جس طرح غداری کی، ملت اسلامیہ کے مفاد کو جس طرح نقصان پہنچایا، استعمار زرنگ کی جس طرح تقویت کا موجب ہوا اس سے ایک دنیا واقف ہے۔

بعض خوش عقیدہ لوگ، شریف حسین کو صرف اس لئے عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، کہ وہ سید یعنی شریف تھا، آل رسول تھا، وہ اس زریں اصول کو بھول گئے تھے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ

پسرِ نوح با بداں بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد!

محمد علی ان لوگوں میں تھے، جو اس کے نسب کو نہیں، اس کے کردار کو دیکھتے تھے، اسی لئے وہ شریف حسین کے سخت مخالف تھے، اور اسے "شریف بے شرف" کہا کرتے تھے۔

اصحاب میمنہ

سلطان ابن سعود نے جب حجاز کی بادشاہی کا اعلان کیا، اور مملکت حجاز کو "سعودی عربیہ" کا ایک جزو بنا لیا، تو محمد علی نے اسی زور و قوت سے مخالفت کی، جس جوش و خروش سے سلطان کی حمایت کی تھی۔

ہندوستان کی جماعت اہل حدیث، بربنائے عقیدہ (نہ کہ بربنائے اصول) سلطان سے بہت محبت کرتی تھی، اور سلطان بھی اس کے حفظ مراتب کا بہت خیال رکھتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں، جو "موتمر عالم اسلام" منعقد ہوئی تھی، اس میں علی برادران نے بھی شرکت کی تھی، اور جماعت اہل حدیث کے متعدد سر برآوردہ اصحاب بھی رونق افروز تھے، سلطان نے موتمر میں نشست کی ترتیب یہ رکھی کہ داہنی طرف اہل حدیث اصحاب کو جگہ دی، محمد علی نے ان اصحاب کو فوراً "اصحاب میمنہ" کا خطاب دے دیا۔

یہ قرآنی تلمیح کچھ اس برجستگی کے ساتھ محمد علی کی زبان سے نکلی، کہ زبان زد خاص و عام ہو گئی۔

پھلواری میں پھول!

گنبد خضرا پر جب گولہ باری کی خبر مشہور ہوئی تو احتجاج و برہمی کے علم اور پرچم لے کر، وہ بزرگ بھی اپنے گوشۂ اعتکاف سے باہر آگئے، جو اب تک خاموش تھے، اور پبلک سرگرمیوں سے ترک تعلق کر چکے تھے۔

انہی بزرگوں میں بہار کے مشہور صاحب طریقت بزرگ حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواری مغفور بھی تھے، اس سلسلہ میں ایک قابل اعتراض پمفلٹ شائع ہوا، اس پر منجملہ اور اصحاب کے شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا اسم گرامی و نام نامی بھی تھا۔

محمد علی نے اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے "ہمدرد" میں لکھا:

"لکھنؤ کے اشتہار میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کا نام بھی درج ہے، اللہ اللہ اس پھلواری میں بھی مدت کے بعد پھول آئے ہیں!"

(۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء)

پھلواری کے پھول ایک عرصہ تک ادب اردو کے مشام جان کو معطر کرتے رہے!

رحلت رشیدیہ

عربی میں "سفر" کو "رحلت" کہتے ہیں، اور اردو میں اس سے

"سفرِ آخرت" مراد لیا جاتا ہے، مثلاً "رحلت ابن بطوطہ" کا ترجمہ اردو میں "سفر نامہ ابن بطوطہ" ہی ہو گا، لیکن اسی جملہ کو اگر خالص اردو محاورہ کے ماتحت استعمال کیا جائے، تو اس کا مفہوم "ابن بطوطہ کا انتقال پُرملال" کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

علامہ رشید رضا صاحب "المنار" مصر، جب موتمر عالم اسلام سے شرکت کر کے واپس پہنچے، تو انہوں نے اپنے پرچہ میں اپنی "رحلت" یعنی سفر کے حالات لکھنا شروع کیے۔

محمد علی نے "رحلت رشیدیہ" کے عنوان سے اُردو داں پبلک کو اس سے روشناس کرایا۔

قطب نما!

تحریک خلافت کے مخلص، اور دیرینہ کارکنوں میں ایک صاحب مسٹر قطب الدین صدیقی ہیں، ہندوستان میں دوسری خلافت کمیٹی انہی نے قائم کی تھی، "خلافت" اخبار بھی سب سے پہلے انہی نے نکالا تھا، جو بعد میں مجلس خلافت کا آرگن بنا۔

محمد علی قطب صاحب کو بہت مانتے تھے، جب وہ جیل سے تین برس کی سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو "ہمدرد" میں، ایک اداریہ لکھ کر تعارف کرایا۔

مسلمانان دہلی کی طرف سے قاری عباس حسین صاحب نے جس جلسہ میں انہیں سپاسنامہ پیش کیا تھا، اس کی تفصیل بھی انہوں نے ہمدرد میں

چھاپی، بعد میں، انہی کے ایما سے شوکت صاحب انہیں مجلس خلافت کے صدر دفتر بمبئی میں لے آئے!

قطب صاحب مع بال بچوں کے خلافت ہاؤس میں رہتے تھے، محمد علی بھی اکثر وہیں آیا کرتے تھے، قطب صاحب کی ایک اسم با مسمّٰی بچی تھی، "آفتاب بیگم" محمد علی اسے بہت چاہتے تھے، انہیں بچوں سے بڑا اُنس تھا، آفتاب سے بھی وہ بڑی دیر تک کھیلا کرتے تھے، پیار سے "قطب نما" کہتے تھے۔

غیر مقلّد مقلّد

محمد علی نے جب سلطان ابن سعود کی مخالفت کی، تو حامیان سلطانؔ نے ان کی مخالفت پر کمر باندھ لی، ان کے مخالفین میں پیش پیش بعض سربرآوردہ اہل حدیث (یا غیر مقلد) اصحاب تھے، ان کی طرف سے محمد علی پر طرح طرح کے اعتراضات ہوتے رہتے تھے۔

ان اصحاب کو جواب دیتے ہوئے ایک مرتبہ محمد علی نے "ہمدرد" میں لکھا:۔

"تم جھوٹ بولتے ہو، تب بھی کولانہ تقلید سے احتراز نہیں کرتے ہو، یوں (اپنے تئیں) "غیر مقلد" کہلاتے ہو۔"

(۲۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء)

فعل فیصل

"قول فیصل" تو آپ نے بارہا سنا ہوگا، اب ذرا "فعل فیصل" کی روداد سُن لیجیے۔

سلطان ابن سعود کے چھوٹے صاحبزادے شاہزادہ "فیصل" دیارِ فرنگ کی سیر کو روانہ ہوئے، لندن پہنچے، اور ایک شاہزادہ کی طرح، وہاں کے بے حجاب جلووں، وہاں کی رنگ آرائیوں، وہاں کی شیوہ طرازیوں، وہاں کی رنگینیوں، اور وہاں کی برق پاش تجلیوں کا مشاہدہ کیا، اور کھو گئے۔

یہ اس باپ کا بیٹا تھا جو "تمسک بالکتاب والسنۃ" کا مدعی تھا، جو منہاج خلافت راشدہ پر ایک نیا نظام حجاز میں رائج کرنا چاہتا تھا، اور دنیا کو بتانا چاہتا تھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کے کارنامے پھر سے تازہ ہو سکتے ہیں۔

ایسے باپ کے بیٹے کو فرنگستان کی گلیوں میں گھومتے، دیکھ کر، محمد علی سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اپنے دردِ دل کا اظہار ایک مضمون میں کیا جس کا عنوان رکھا "فعل فیصل"

داخل خارج

نہرو رپورٹ کے بعد جب محمد علی کو یقین ہو گیا، کہ کانگریس

مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کرنا چاہتی تو وہ اپنا یہ شعر؎

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

پڑھتے ہوئے کانگریس سے نکل آئے۔

بعض دوستوں نے محمد علی سے اصرار کیا کہ وہ پھر کانگریس میں شریک ہو جائیں، اس مطالبے کے جواب میں انہوں نے کہا یہ بار بار کا "داخل خارج" مجھے پسند نہیں!

مہاراجہ نابھہ

مہاراجہ نابھہ، ایک آزاد خیال، اور بیباک مزاج فرماں روا تھے والیان ریاست میں ان جراثیم کا نشو و نما حکومت برداشت نہیں کر سکتی، چنانچہ پہلے تو انہیں تخت حکومت سے دستبردار ہونا پڑا پھر بھی حکومت مطمئن نہ ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خطاب ضبط ہو گیا، اور انہیں ایک دور دراز مقام کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔

محمد علی، مہاراجہ کی اس بے بسی سے بہت متاثر تھے، انہوں نے "ہمدرد" میں ایک مضمون لکھا:۔

"آج مہاراجہ (نابھہ) کسی معنی میں بھی مہاراجہ نہیں ہیں، البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصائب، آلام اور افکار کے وہ آج بھی راجہ نہیں "بلکہ مہاراجہ ہیں"!

(۱۱ر فروری سنہ ۱۹۲۵ء)

مجہولات عامہ

حکومت ہند نے، اور اس کی تقلید میں صوبائی حکومتوں نے بھی عوام کو اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے، اور انہیں اپنی پالیسی سے متعلق صحیح اور مستند اطلاعات دینے کے لئے، ایک محکمہ "معلومات عامہ" کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔

یہ محکمہ، لغویت، اور اہمال کا مجموعہ ہے، صحیح اطلاعات نہیں شائع ہوتیں، جو کچھ شائع ہوتا ہے، وہ بالعموم بعد از وقت، جن مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے، وہ ایسے مبہم انداز میں کہ، ع

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

محمد علی نے اپنی زبان میں اس کا نام رکھا تھا "محکمۂ مجہولات عامہ"۔

صوبہ جات غیر متحدہ

شدھی سنگٹھن کے زمانہ میں مسلم آزار تحریکوں اور سرگرمیوں کا مرکز، صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ تھا، محمد علی مسلمانوں کی جارحانہ سرگرمیوں کو روکے ہوئے تھے، اور چاہتے تھے، کانگرسی رہنما اسی طرح مہاسبھائیوں کو روکیں، اور ہندو مسلم اتحاد کی مخلصانہ کوشش شروع کریں۔

بدقسمتی سے، یو، پی، میں کانگریسیوں کی ایک ایسی جماعت بھی تھی،

جو بیک وقت کانگرسی بھی تھی، اور مہاسبھائی بھی!

پنڈت گوبند بلبھ پنتھ کی صدارت میں ایک پولیٹیکل کانفرنس، علی گڑھ میں منعقد ہوئی، اس میں محمد علی نے شرکت کی تھی، یہاں کے دلگداز حالات دیکھ کر انہوں نے "ہمدرد" میں اپنے تاثرات شائع کئے:

"نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں اس صوبہ کا نام "صوبہ جات متحدہ" رکھا گیا تھا، وہ دن ہے اور آج کا دن، اس سے زیادہ، صوبہ جات غیر متحدہ" کے نام کا کوئی صوبہ پنجاب کے سوا مستحق نہ ہوگا!"

(یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

دائرۃ السوء

دہلی میں مرکزی اسمبلی کی عمارت گول ہے، اس اسمبلی کے بارے میں محمد علی کا خیال تھا، ع

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

انہیں مجالس آئین ساز پر ذرا اعتماد نہ تھا، وہ اسمبلی کے مباحث کو جنگ زرگری سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

اسمبلی کے ایوان مدور کا نام، انہوں نے "دائرۃ السوء" رکھا تھا!

سوالی تعاون

آج سے بیس برس پہلے چوری چورا کے بعد جب گاندھی جی نے تحریک سول نامتابعت ملتوی کردی تھی، اس کے بعد ملک پر ایک عام یاس اور سرد مہری کی کیفیت طاری ہوگئی تھی، تمام کانگرسی رہنما جیل بھیج دیے گئے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد لیڈروں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا، محمد علی شوکت علی، گاندھی جی، جواہرلال، وغیرہ رہا ہوئے، لیکن یہ سب اب تک "نو چینجر" تھے، "تارک موالات" تھے، حکومت سے تعاون کو ناجائز سمجھتے تھے۔

موتی لال نہرو، جیل سے رہا ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ایک نئی اصطلاح "جوابی تعاون" کی لائے، یعنی ہم اب قانون شکنی نہیں کرنا چاہتے، لیکن اگر حکومت وسعت تعاون بڑھائے، تو ہمیں بھی تعاون کرنا چاہیے، علی برادران اور گاندھی جی، داخلۂ کونسل کے سخت مخالف تھے، اور موتی لال بقول محمد علی کے کہہ چکے تھے، اگر کانگرس نے داخلۂ کونسل کی اجازت نہ دی تو میں ڈھائی سو میل اس کے ارد گرد قدم نہیں رکھوں گا۔

ان جوابی تعاون والوں کو محمد علی "سوالی تعاون" کا علمبردار کہتے تھے۔

آصف نما

مولنا سید سلیمان ندوی، اور مولنا مسعود علی ندوی کے باہمی تعلقات مودت و اخوت ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند تھے، انہوں نے سید صاحب کو خط لکھا، مولنا مسعود علی نے شکایت کی ہے

گل پھینکے ہیں غیروں کی طرف اور ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

محمد علی نے جواب دیا، تم میں، اور سید صاحب میں فرق ہی کیا ہے؟

"اب تو جب حضرت سلیمان کا تصور کرتا ہوں، مسعود آصف نما پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں!"

(۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء)

گھڑی!

بڑی سے بڑی مصیبت کے موقع پر بھی، محمد علی کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتے تھے کہ، ع

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

اپنی کراچی جیل کی ڈائری میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ایک اسیر اور آئے، وہی اہتمام، ایک لاری پر مسلح گورا فوج، ایک مسلح ہندوستانی پولس اور بند موٹر میں اسیر غالباً مولانا حسین احمد صاحب ہیں، مجسٹریٹ اس وقت تک نہ آیا تھا، اس لئے روک کے رکھے ہیں، یہ عجیب عالم برزخ ہے، نہ جانے دیتے ہیں نہ آنے دیتے ہیں، دروازہ پہ بٹھا رکھتے ہیں، ع

تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے!

ترجمہ اسماء

میر محفوظ علی صاحب بدایونی کا ارشاد ہے:۔

"محمد علی کی چلبلی شوخ طبیعت، سادہ الفاظ اور آسان طرز ادا کی جگہ غالب کی طرح کسی قدر پیچدار طرز ادا کی دلدادہ تھی، وہ مذاق میں الفاظ و اسما کو اپنے رنگ میں کہنے کے عادی تھے بمبئی میں ایک ریلوے اسٹیشن چرچ گیٹ ہے، جسے وہ "باب کلیسا" کہتے تھے (اسی طرح) میرین لائن جسے عوام مریم لین کہتے ہیں وہ اسے "صفوف بحریہ" کہتے تھے، گرانٹ روڈ کا نام رکھا تھا "شارع عطیہ"۔ اس میں جو تلمیح و لطافت ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں۔ جیکب سرکل کا نام رکھا تھا دائرۂ یعقوبی" ان کے ایک ملاقاتی کا نام تھا "چندر سین"

جسے وہ "مہبط" کہتے تھے،

چندر = مہ — سین = ہبط "مہبط"!

سوراج

کراچی کی عدالت میں، جب محمد علی پر بغاوت کا مقدمہ چلا، تو مجسٹریٹ کے روبرو، انہوں نے سوراج کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:۔

"سوراج کا مقصد SERVE NO RAJ ہے یعنی کسی حکومت کی تابعداری نہ کرنا!"

نعم الوکیل!

محمد علی پر کراچی میں مقدمہ چل رہا ہے وہ حوالات میں ہیں، اپنی ایک ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:۔

سپرنٹنڈنٹ آکر ایک تحریر سنا گیا کہ ۲۶ر کو مقدمہ ہے تیار ہو جاؤ، الحمدللہ، اس کی ضرورت ہی نہیں، ضرورت اس کو ہو جو پیروی مقدمہ کرے، ہم کو اللہ سا "نعم الوکیل" چاہیے!"

باب (۱۰)

بات میں بات

داستان سرائی کا ایک جزو بات میں بات پیدا کرنا ہے، محمد علی ایک بہترین داستان گو تھے، قوم کا افسانہ ہو، یا درد دل کی کہانی، ملک کی داستان ہو یا قوم کی کتاب زندگی، رزم کا قصہ ہو یا جرم کا بیان محمد علی ہمدرد اور کامریڈ کی مسند پہ بیٹھ کر یا جامع مسجد اور پبلک پنڈال کے پلیٹ فارم پہ کھڑے ہو کر، مطرب یا نغمہ خواں کی حیثیت سے وہ داستان چھیڑتے تھے، جسے سننے والے سن کر رو بھی دیتے تھے، اور ہنس بھی پڑتے تھے، یہ محمد علی کے ہاتھ میں تھا، جب چاہیں رونے لگیں، اور رُلا دیں، جب چاہیں ہنسنے لگیں اور ہنسا دیں۔

داستان بیان کرتے ہوئے یا قصہ خوانی کرتے ہوئے، محمد علی بات میں بات خوب پیدا کرتے تھے، وہ ایک بات کہہ رہے ہیں، کہتے کہتے انہیں

دوسری بات یاد آ گئی، اسے پہلی بات کا پیوند بنا کر وہ اس طرح کھپا دیتے تھے کہ کوئی اجنبیت ہی نہیں محسوس ہوتی تھی، وہ نثر میں گریز اور تشبیب کا کمال دکھاتے تھے، اور حق یہ ہے کہ اس کمال فن کو ان پر ناز تھا، ؎

میرے بیان پہ آج ہے طرزِ بیاں کو ناز

ریاضؔ :-
میری زبان پہ آج ہے اردو زبان کو ناز

رتّی کا بَل

محمد علی بڑے پکّے "نو چنجر" تھے، یعنی جیل خانے سے پہلے وہ ترکِ موالات کی جس روش پہ عامل تھے، جیل سے واپسی کے بعد بھی اسی پر قائم رہے، انہیں مجالس آئین ساز کی رونق ذرا بھی مرغوب نہیں تھی، وہ نہ "جوابی تعاون" کے قائل تھے، نہ "سوالی تعاون" کے، اصل میں وہ "یک طرفہ تعاون" اور منافقانہ تعاون سے نفرت کرتے تھے، وہ حکومت سے نالاں تھے، اور کسی صورت میں اس سے تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ موتی لال نہرو وغیرہ کی طرح زمانہ کے ساتھ اپنی پالیسی بدلنے کے خوگر نہیں تھے، وہ چاہتے تھے، کہ زمانہ ان کی پالیسی پر چلے۔

ان کے دوست احباب بھی انہیں سمجھاتے رہتے تھے، کہ اس روش کو ترک کرو، تعاون نہیں کرتے تو "جوابی تعاون" ہی کرو، اسمبلی کی ممبری کرو الاؤنس لو، سرکاری کمیٹیوں میں شرکت کرو، مزے اڑاؤ، لیکن وہ ؎

حضرتِ ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ

کوئی ہمکو یہ تو بتلادو کہ سمجھائیں گے کیا؟

کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے، اب سنئے محمد علی کیا کہتے ہیں:۔

"لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ سب ہار کے جھک مار کے حکومت کے ساتھ موالات پر اتر آئے، مگر ان (علی برادران) کو دیکھئے، رسّی جل گئی، مگر اس کا بل نہیں جلا، مگر ہم تو حبل اللہ (اللہ کی رسّی) کو پکڑے ہوئے ہیں، وہ کیسے جلے گی، ہمارا ہاتھ تو "عروۃ الوثقیٰ" مضبوط رسّی پر ہے اور اس کی تعریف تو قرآن میں یہ ہے کہ "لا انفصام لہا" وہ ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

خود ہمارے عزیز (نظر بندی کے زمانہ میں) کہتے تھے کیوں ہاتھیوں سے گنّے کھاتے ہو، وہ بظاہر اس خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے، جس نے ابابیلوں سے "اصحاب فیل" کو ہلاک کرایا تھا!"

(۱۵ر مئی ۱۹۲۵ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ محمد علی کا ذہن کس طرح "رسّی" سے "حبل اللہ" اور "عروۃ الوثقیٰ" تک، اور ہاتھی سے "اصحاب فیل" تک منتقل ہو گیا؟ یہی محمد علی کی ذہانت کا کمال تھا!

"راس امید"

سلطان ابن سعود کے صاحبزادے شہزادہ فیصل لندن تشریف لے جاتے ہیں، وہاں کے بتان سیمیں بدن اُن پر ٹوٹ پڑتے ہیں، مشرق کا شہزادہ، الف لیلہ کا ہیرو، عرب کا شیخ، وہاں پہنچا تھا، کیا تماشائیوں کی کچھ کمی ہو سکتی تھی؟

محمد علی لندن کے اخبارات کے تراشے منگاتے رہتے تھے، وہ سب کچھ دیکھتے ہیں، ان کی زبان داستان سرائی پر مائل ہوتی ہے، اور داستان سرائی کرتے کرتے بات میں بات بھی پیدا کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

"یورپ پر مسلمانوں کی "قوت" کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے، اور عام خیال ہے کہ ہر مسلمان کا گھر، سو دو سو بیویوں، اور باندیوں کی حرم سرا ہے، اس لئے یورپ کی شوقین لڑکیاں، جن کی طبیعت بوس و کنار کو سینما میں دیکھتے دیکھتے بھر گئی ہے اس نئی دنیائے حسن و عشق کی کولمبس بننا چاہتی ہیں، جس کا نام مشرق ہے، اور اس نئے راستہ کی واسکوڈا گاما ہونے کی خواہش مند ہیں جو "راس امید" سے ہو کر ایک مسافر کو مشرق تک پہنچاتا ہے!"

(۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۶ء)

کولمبس، اور واسکوڈا گاما کو چھوڑیئے، اور "راس امید" کی بلاغت

کی داد دیجیے۔

بوزنیت سے اپیل

جنوبی افریقہ کا "پیگنگ بل" جس طرح آج ہندوستان میں ایک طوفان برپا کیے ہوئے ہے، اسی طرح آج سے ۱۷، ۱۸ برس پہلے وہاں کے "ایشیاٹک بل" نے بھی ہندوستان بھر میں غم و غصہ اور احتجاج و اضطراب کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔

دہلی میں ایک جلسۂ عام، "ایشیاٹک بل" پر احتجاج کرنے کے لیے منعقد ہوا، سوامی شردھانند آنجہانی کے صاحبزادہ پروفیسر اندر نے ایک تقریر میں انسانیت کے نام پر انگریزوں سے اپیل کی، کہ جنوبی افریقہ میں ان ہندوستانیوں سے خلاف انسانیت سلوک نہ روا رکھا جائے، جنہوں نے اس کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

پروفیسر اندر کے بعد، محمد علی تقریر کے لیے اُٹھے، انہوں نے فرمایا:۔

"لیکن صاحبو! وہ (انگریز) کب کہتے ہیں کہ ہم میں انسانیت ہے؟ بہت ندرد یا تو یہ کہہ چھوٹ جائیں گے، کہ ہم اولادِ آدم ہی نہیں، ہم تو بقول ڈارون بندر کی اولاد ہیں، اس وقت میرے بھائی اندر صاحب کیا ان کی "بوزنیت" سے اپیل کریں گے؟!"

(۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

انسانیت کے نام پر اپیل سنتے ہی، محمد علی کو جناب ڈارون یاد آ گئے، پھر ان کا نظریہ بوزنیت یاد آ گیا، اور اس کے یاد آتے ہی انہوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان میں وہ لطیف بات کہہ دی کہ آج اگر ڈارون زندہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی داد دیتا۔

کثرت و قلّت

جو لوگ ہندوؤں کی اکثریت، اور مسلمانوں کی اقلیت کا خوف و دہشت کے ساتھ بار بار تذکرہ کرتے تھے، انہیں جواب دیتے ہوئے محمد علی نے فرمایا:۔

"کثرت و قلت سے خوف کھانا مسلمان کا شیوہ نہیں، ہمارے آبا و اجداد ایک خدا کو ماننے کے باوجود تین خداؤں سے خائف نہ تھے"

(۲۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء)

کثرت و قلت کے ذکر پر وحدت اور تثلیث تک صرف محمد علی ہی کا ذہن منتقل ہو سکتا تھا۔

دلچسپ توجہ

ہندوستان میں جب سائمن کمیشن ورود فرما ہوا، تو محمد علی نے اس کی شدید مخالفت کی، لیکن مولانا حسرت موہانی چاہتے تھے، اس سے

"مقابلہ" کیا جائے، اور اس کی صورت یہ تھی کہ اس سے تعاون کیا جائے، سر شفیع مرحوم بھی، حسرت موہانی صاحب کے اس نظریہ سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے، چنانچہ حسرت صاحب، سر شفیع کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوئے، جو سائمن کمیشن کی حمایت میں منعقد ہوتے تھے۔

لکھنؤ میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا، جلسہ کی غرض وغایت یہ تھی کہ سائمن کمیشن کی آمد کے خلاف احتجاج کیا جائے، اس جلسہ میں محمد علی خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے، مولانا حسرت بھی تشریف رکھتے تھے، محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"ایک بزرگ تھے جن کو سماع کا بہت شوق تھا، ایک دوسرے بزرگ کو سماع سے نفرت تھی، جب ایک دن وہ اپنے ان دوست کے ہاں پہنچے، تو محفل سماع قائم تھی، یہ دیکھتے ہی انہوں نے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا، جس پر صاحب خانہ نے کہا، ذرا آنکھیں بند کر لیجئے، تھوڑی دیر کے بعد کہا اب آنکھیں کھول لیجئے، اور بتایئے کہ آپ نے کیا دیکھا؟

انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا رسول اللہؐ آپ کے گھر میں داخل ہو رہے ہیں، صاحب خانہ نے کہا رسول اللہؐ بھلا محفل سماع میں تشریف لاتے اگر اس کو صحیح سمجھتے؟ دوسرے بزرگ نے فرمایا، کیا معلوم منع ہی کرنے تشریف لائے ہوں؟ ——— امید ہے مولانا حسرت موہانی

سر محمد شفیع وغیرہ کو اپنی حرکات سے باز آنے کے لئے ہی کہنے جاتے ہوں!"

(۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء)

آپ بیتی!

اپنی داستان غم بیان کرتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں:۔

"تھیکرے انگلستان کے مشہور ناول نگار نے ایک ناول میں اپنے ہیرو کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ آکسبرج کی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، تو نہ اس کے کپڑے فلاں طالب علم کے کپڑوں سے زیادہ قیمتی تھے، نہ اس کی کتابوں کی جلدیں فلاں دوسرے طالب علم کی کتابوں کی جلدوں سے زیادہ قیمتی تھیں، نہ اس کی سواری کا گھوڑا فلاں تیسرے طالب علم کے گھوڑے سے زیادہ داموں کا تھا، نہ اس کے کمرہ کا فرنیچر فلاں چوتھے طالب علم کے کمرہ کے فرنیچر سے گراں تر تھا، نہ اس کے کمرہ کی تصویریں اتنی قیمتی تھیں، نہ وہ اتنے اسراف سے اپنے دوستوں کو کھانا کھلایا اور شرابیں پلایا کرتا تھا، جتنے اسراف سے فلاں چھٹا طالب علم کھلایا پلایا کرتا تھا، نہ وہ جوے میں اتنا روپیہ کھوتا تھا جتنا کہ فلاں ساتواں طالب علم لیکن آکسبرج یونیورسٹی

کے کسی طالب علم کا خرچ اس کے خرچ کے برابر بلکہ اس کے ذرا قریب بھی نہ ہوتا تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر چیز میں دوسرے نمبر پر تھا۔

یہی حالت میری ہے، نہ کانگرس میں، نہ مسلم لیگ میں، نہ خلافت میں، نہ جمعیت علما میں، نہ مؤتمر عالم اسلام میں، نہ تبلیغ میں، نہ تنظیم میں، نہ جامعہ ملیہ میں، نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، نہ ندوہ میں، میرا پہلا نمبر ہے، یقیناً ان سب تحریکوں اور سب مجالس و مدارس میں سے ہر ایک میں اور بزرگ مجھ سے زیادہ مشغول و مصروف ہیں، لیکن میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ ان سب تحریکوں میں مجھ سے زیادہ کوئی مشغول و مصروف نہیں، سیاست میں اور تعلیم میں، دین میں اور دنیا میں، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں، اور اسلامی ممالک کی ترقی کی تحریک میں، ہر ایک میں شامل ہوں، اور ہر ایک میں مجھے شامل ہونا پڑتا ہے!"

(۲۹ر فروری ۱۹۲۸ء)

آکسبرج یونیورسٹی کے ہیرو کا ذکر کرتے کرتے، محمد علی کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟ لیکن کس خوبی، اور طرز ادا سے!

بادشاہ کی ضرورت

ملوکیت، بادشاہت، مطلق العنانی، یہ وہ نظام تھا جس کے محمد علی باغی تھے، اس نظام سے کسی قیمت، کسی حالت، کسی صورت میں وہ مفاہمت کر ہی نہیں سکتے تھے، یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے بدترین دشمن سے صلح کر لیں، لیکن یہ ناممکن تھا کہ وہ بادشاہت کی بھلائی اور اچھائی تسلیم کریں۔

شام کے مسلمانوں نے ـــ ایک خبر کے مطابق ـــ طے کیا کہ اپنے ہاں بادشاہی نظام رائج کریں گے، جمہوریت کے بجائے، وہ شہنشاہیت کو ترجیح دے رہے تھے، ان کی نگاہ انتخاب سلطان ابن سعود کے صاحبزادے پر پڑ رہی تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"جہاز پر خبر پڑھی کہ شامیوں نے فیصلہ کیا ہے، کہ ایک بادشاہ کی ضرورت ہے، چنانچہ "ابن سلطان ابن سعود" پر ان کی نظر انتخاب پڑی ہے، سچ ہے، ملکیت کی بدعت کی ابتدا شام ہی سے ہوئی تھی، اب یزید کی ملکیت کی جگہ نجدیوں کی ملکیت طلب کی ہے!"

(۹ر جون ۱۹۲۸ء)

شام! یہ نام سنتے ہی، محمد علی کے سامنے، امیر معاویہ کی بادشاہت یزید کی جانشینی، اور نخل اسلام پر پہلی "ضرب شدید" کی ساری تفصیل

یاد آ گئی !

باب (۱۱)

ظرافت !

ظرافت، محمد علی کا اوڑھنا بچھونا تھا، ہر وقت ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، کبھی وہ پھول دہکتے ہوئے انگارے بن جاتے تھے، اور کبھی یاسمین و ریاحین !

خوش طبعی اور ظرافت کی کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی تھی، ان کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں افکار و ہجوم سے سابقہ تھا، فی لعنت، لگام گلوچ بدگوئی، دراندازی، یہ وہ محاذ تھے، جن پر انہیں لڑنا پڑتا تھا، وہ لڑتے تھے اور اس شان سے لڑتے تھے، کہ ہارنا جانتے ہی نہیں تھے، تھکنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، یہ لڑائی، دوستوں اور دشمنوں، بیماریوں، اور ناسازگاریوں، مصیبتوں، اور طوفانوں سے انہوں نے جاری کر رکھی تھی، اس طرح نہیں کہ مقابلہ تو کر رہے ہوں، لیکن بادل نخواستہ، نہیں

بلکہ اس طرح کہ لب تبسم سے آشنا، مزاج خوش طبعی پر مائل، طبیعت ظرافت اور خوش گوئی کا مرکز۔

سفر یورپ

۱۹۲۸ء میں وہ بغرض علاج یورپ تشریف لے گئے، ذیابطیس کا علاج مقصود تھا۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کو لکھتے ہیں:۔

"محض اپنی صحت کی اصلاح کے لئے (ولایت) بھیجا گیا ہوں اس پر ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بہ صرف کثیر اس لئے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کر کے اپنا علاج کرائے!"

(۶ جون ۱۹۲۸ء)

موجوں کا ناچ

اسی مکتوب میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کو "جہاز" اور "سمندر" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آج شب کے ساڑھے آٹھ بجے سے جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے، جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے، حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش

پڑے تھے، اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا!"

(۶ جون ۱۹۲۸ء)

"محمد علی شوکت علی"

ہندوستان کی سیاسیات میں آج سے چند برس پہلے دو نام بہت زیادہ محبوب تھے، "محمد علی شوکت علی!"

ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ہر مسلمان کے دل میں، تصور میں، نگاہ میں، "محمد علی شوکت علی" رچے ہوئے تھے، ان دونوں بھائیوں پر پروانہ وار لوگ گرتے تھے، ان سے انہیں وہ عقیدت و محبت تھی، جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دونوں بھائی، ہم شبیہ بھی تھے، اور ڈیل ڈول بھی ملتا جلتا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دوسرے سے اس درجہ مربوط اور وابستہ تھے کہ بہت کم جدا ہوتے تھے، جلسوں میں، جلوسوں میں جب دیکھئے، یہ کوہ پیکر، اور کوہ وقار بھائی ساتھ ہی ساتھ نظر آئیں گے، ان دونوں کو لوگ اتنا زیادہ ساتھ دیکھ کر پہچان لیتے تھے کہ یہ "محمد علی شوکت علی" ہیں ان میں محمد علی کون ہے، اور شوکت علی کون ہے؟ اس امتیاز و تفریق کی نہ چنداں ضرورت تھی نہ موقع؛

اتفاق سے اگر کبھی ایسا ہوتا کہ محمد علی صاحب، یا شوکت صاحب صاحب، تن تنہا کسی شہر یا دیار میں وارد ہوتے، تو بڑی مشکل پیش

آتی کہ ان صاحب کو محمد علی سمجھا جائے یا شوکت علی؛ عوام کا ذہن اس طرح کی مشکلات کو بڑی خوبی سے حل کر لیتا ہے، چنانچہ یہ مشکل اس طرح حل کی گئی کہ اگر ایک مجمع میں صرف محمد علی تقریر کر رہے ہیں، شوکت علی نہیں موجود ہیں، کسی نے پوچھا یہ کون ہیں؟ جواب ملا "محمد علی شوکت علی" یہ دونوں بھائی جس طرح حقیقۃً ایک جان دو قالب تھے، اسی طرح عملاً بھی نگاہ عام ان دونوں میں تفریق نہیں کرتی تھی، شوکت علی ہوں یا محمد علی، دونوں ساتھ مل کر بھی "محمد علی شوکت علی" تھے، اور الگ الگ بھی "محمد علی شوکت علی" تھے!

یہ چیز اتنی عام ہو گئی تھی کہ ہندوستان سے باہر بھی یہی طرز فکر تعارف عام ہو گیا تھا۔

یورپ جاتے ہوئے محمد علی عدن میں تھوڑی دیر کے لئے اُترے فرماتے ہیں:۔

"جوں ہی عدن کے ساحل پر اُترا عرب صرافوں، پولیس والوں، قلیوں، اور ٹیکسی والوں نے پہچان لیا، یہ "محمد علی شوکت علی ہے!"

(۶ رجون ۱۹۲۸ء)

سجدہ کا نشان!

اپنے ایک مکتوب میں اپنے ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"(میں نے) مصلّے پر نماز شروع (کی)، اور گو سجدہ کا نشان میری جبیں پر اب تک نہیں پڑا، لیکن میری ایڑیوں نے اس مصلے پر چھید کر دیے ہیں!"

کیا خوب!

مرض کا شکریہ

ذیابیطس جیسا مہلک اور جان لیوا مرض ہے، سب جانتے ہیں محمد علی اس مرض کے مریض تھے، اور اس سے سخت پریشان رہتے تھے، یہی مرض تھا جس نے ان کے تنومند جسم کو گھن کی طرح کھا کر ایک خالی لفافہ بنا دیا تھا۔

یورپ جا رہے ہیں، ایک کام سے صبح تڑکے اٹھنا ہے، رات کو دیر سے سوئے ہیں، اس لئے امید نہیں کہ وقت پر آنکھ کھلے، لیکن "خدا ذیابیطس کا بھلا کرے، چار بجے سے پہلے ہی آنکھ کھل گئی!"

(۶ رجون ۱۹۲۶ء)

یہ محمد علی کی خاص ادا تھی، وہ برائی میں بھلائی کا، اور بھلائی میں برائی کا، حسب موقع، پورے لطف کے ساتھ موقع نکال لیا کرتے تھے۔

قاہرہ کی سیر

یورپ جاتے ہوئے، محمد علی کچھ دیر کے لئے قاہرہ میں اُترتے ہیں سیر کرتے ہیں، اس سیر کا ذکر کرتے ہوئے، مولنٰا عبد الماجد دریا بادی کو لکھتے ہیں:۔

"صبح کے تین بجے تک بازاروں میں چہل پہل رہی، اور ہم سیر کرتے پھرے، ایک جگہ محفل رقص و سرود گرم تھی، اور ایک لحیم شحیم خاتون، جو بظاہر قاہرہ کی گوہر جان تھیں، ناچ اور گا رہی تھیں،

اس خاتون کے فقرے پر بار بار سامعین، اور ناظرین میں سے لوگوں نے "قتلتنی یا ستی!" کہنا شروع کیا، جسے اُردو میں "ہائے جانی مار ڈالا!" ہی کے جملے سے ادا کیا جاسکتا ہے!"

ترجمہ کی بلاغت، اور اس کے ساتھ جسارت ملاحظہ فرمایئے!

ممکن ہے "قتلتنی یا ستی" کا وہی ترجمہ جو محمد علی نے کیا ہے کسی اور کے ذہن میں بھی آجاتا، لیکن یقیناً وہ اس بے ساختگی سے اپنا ترجمہ نہیں پیش کرسکتا تھا جس طرح محمد علی نے کیا، یہ انہی کا حصہ تھا، اور اس میں وہ یقیناً "لاشریک لہٗ" تھے!

ہندوستان کا مصر کو تحفہ

قاہرہ میں محمد علی کی خاصی آؤ بھگت ہوئی، شبان المسلمین والے بزرگ ڈاکٹر عبد الحمید نے ایک جلسہ بھی ان کے اعزاز میں کیا، اس جلسہ میں محمد علی نے ایک برجستہ تقریر ارشاد فرمائی۔

اپنی تقریر میں انہوں نے اس پر زور دیا کہ مصر کے مدبرین کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان بھی آیا کریں، اور مسلمانانِ ہند کے حالات و واقعات کا براہ راست مشاہدہ کیا کریں، پھر محمد علی نے کہا، آپ لوگ ماشاء اللہ متمول ہیں، لیکن ہمارے ہاں آنے میں اس درجہ بخیل ہیں، ہم غریب ہیں لیکن ہماری شاہ خرچی دیکھیے کہ مصر بھی پہنچے رہتے ہیں۔

اپنی تقریر میں، محمد علی نے جارج لائڈ کا ذکر بھی کیا، یہ بمبئی کا گورنر رہ چکا تھا، سخت گیر آدمی تھا، قاہرہ سے اس نے مولنٰا ظفر علی خاں کو کھڑے کھڑے نکال دیا تھا، وہاں یہ ہائی کمشنر ہو کر گیا تھا، اور سارے مصر کو اپنا زیر نگیں سمجھتا تھا، مولنٰا ظفر علی خاں نے پوچھا، تم مجھے کس قانون سے نکالتے ہو؟ اس نے چمک کر جواب دیا قانون؟ "میں حکومت مصر ہوں!"

ہاں تو ان جارج لائڈ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا۔

"ہم یہی نہیں کرتے کہ خود آتے ہیں بلکہ اپنے تجربہ کار گورنروں کو آپ کی ملازمت کے لئے بھیج دیا کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے مجلس (یعنی ہندوستان) کے افسر اعلیٰ لارڈ جارج لائڈ

"اب آپ کے مجلس (یعنی مصر) کے افراعلیٰ ہیں!"
حاضرین پھڑک اُٹھے!

دعوت!

مصر میں محمد علی کی کئی جگہ دعوتیں بھی ہوئیں، ایک دعوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"گوشت کے ٹکڑوں کو اس خوبصورت طریقہ سے جمع کیا گیا تھا کہ بالکل ایک بالشتیہ اونٹ معلوم ہوتا تھا، عمر بھر میں شاید (اس طرح) ڈٹ کر میں نے کبھی کھانا کھایا ہوگا۔

میری کیفیت بالکل ان بزرگ کی سی تھی، جو کسی دعوت میں جاتے تھے تو پہلے خوب کھلکھلا کر ہنستے تھے، پھر رفتہ رفتہ ہنسی بند ہو جاتی تھی، اور بالکل خاموش ہو جاتے تھے، آخر میں رو پڑتے تھے، اور چیخیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔

جب پوچھا جاتا، کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے؟ تو فرماتے، جب اتنا لذیذ اور کثیر المقدار کھانا دیکھتا ہوں، تو خوشی کو ضبط نہیں کرسکتا پھر جب کھاتے کھاتے پیٹ بھرنے لگتا ہے تو اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ جو کچھ دسترخوان پر

ہے، اسے کس طرح ختم کروں؟ اور جب ناممکن ہو جاتا ہے کہ ایک نوالہ بھی کھاؤں تو باقی کھانے کو دسترخوان پر دیکھ کر آنسو نکل پڑتے ہیں (پھر) میں عالم حسرت میں چیخیں مار کر نہ روؤں تو کیا کروں؟"

محمد علی جس طرح دوسروں کا مذاق اڑاتے رہتے تھے، اپنا مذاق اڑانے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے، یہی ظرافت کی جان ہے!

جالی کے پھندے!

مصر میں کس طرح کا پردہ رائج ہے؟ اور وہاں کی عورتیں کس طرح نقاب کا استعمال کرتی ہیں؟ اور اس سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں، اسے محمد علی کی زبان فصاحت نشان سے سنئے!

"جو عورتیں اب تک برقعہ پوش ہیں، ان کی نقاب بھی اتنی باریک ہے کہ سارا چہرہ نظر آتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حسن کو دوبالا کر دیتا ہے، جالی کے پھندے، عشاق کو گرفتار کرنے میں اچھی طرح کام دے سکتے ہیں!"

"سیاسی صورت حال"

جہاز کا ایک انگریز، محمد علی پر نظر رکھے ہوئے تھا، گویا ان کی

نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا تھا، قاہرہ کی سیر کر کے جب محمد علی جہاز پر واپس گئے، تو اس انگریز سے اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔

یہ روداد بھی خود محمد علی جوہر کی زبان گوہر بار سے سُنئے :-

"(ان انگریز صاحب نے) فرمایا کہو مصر کی سیاسی صورت حال کیسی ہے ؟ میں نے کہا، مجھے نہیں معلوم مصر کی سیاسی صورت حال کیسی ہے ؛ میرا کام تو اسی قدر ہے، کہ ہندوستان کی صورت حالات آپ کے لئے خراب کرتا رہوں، بحمداللہ مصر میں بھی بہت سے لوگ موجود ہیں جو یہاں کی صورت حالات کو آپ کے لئے خراب کر رہے ہیں —— بہت جھنجھے، کہنے لگے تم صرف اپنے ملک کا فکر کرتے ہو، ہماری سارے ملکوں پر نظر رہتی ہے، میں نے کہا آپ اسی قوم کے تو فرد ہیں جس کے متعلق لارڈ سالسبری نے فرمایا تھا، " ان لوگوں (یعنی انگریزوں) کا ہمیشہ اصرار ہوتا ہے کہ فوراً چاند کو فتح کر لیا جائے، اور اس کے لئے دلیل یہ پیش فرماتے ہیں، کہ اگر ہم نے اسے اپنے سامراج میں ملحق نہ کر لیا، تو مریخ والے اسے ملحق نہ کر لیں ! —— شرما کر خاموش ہو گئے !"

اس بے پناہ حملہ کے سامنے بھلا ٹھہر بھی کون انگریز سکتا تھا !

پیرس میں !

محمد علی پیرس میں چند روز کے لئے آئے ہیں، شیخ الجامعہ مدظلہٗ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے برادر اصغر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے، محمد علی انہیں اپنے عزیز کی طرح مانتے تھے، سوچا یوسف سے مل لیں، ڈھونڈتے ڈھونڈتے بڑی مشکلوں اور دقتوں سے یوسف صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔

اب آگے کی داستان خود محمد علی کی زبان سے سنئے، اور لطف لیجئے :-

"(یوسف کے دروازہ پر) گھنٹی بجائی، ایک عورت نے دروازہ کھولا، یوسف کا نام لیا، تو اس نے سر اس طرح ہلایا کہ دل خوش ہو گیا !

"پوچھنے پر معلوم ہوا کہ (اس عمارت میں لفٹ (برقی جھولا) نہیں ہے، مگر (میں) خوش خوش (اوپر) چڑھتا چلا گیا، حالانکہ سانس مجھ سے بھی پہلے چڑھ گیا !"

زندگی سے لطف لینے، اور اسے لطف سے بسر کرنے کا راز محمد علی کو معلوم تھا !

غریب الوطن

اب محمد علی لندن میں ہیں !

جسٹس سید امیر علی کا انتقال ہوتا ہے، محمد علی ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے ہیں، قبرستان میں مسلمانوں کی قبروں کو ڈھونڈتے ہیں، ان کے کتبے پڑھتے ہیں، اور حالات معلوم کرتے ہیں، ایک قبر آغا خاں کے بھائی کی نظر آتی ہے،

سنیے محمد علی کیا کہتے ہیں:۔

"ایک قبر آغا خاں کے چچا زاد بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے، اس پر آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے:۔

"برادم عزیز

زرفتن تو من از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم"

آغا خاں کو کون "غریب" کہے گا؛ لیکن ان کی "غریب الوطنی" اب ایک ضرب المثل ہے!"

۱۹؍ اگست ۱۹۲۸ء

"شیخ" اور "شیخ زادہ"

امیر علی مرحوم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر، محمد علی اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اور راستہ کا ایک حادثہ بیان کرتے ہیں، انگریزوں کی نظر میں عرب کے "شیخ" کا جو تصور ہے، وہ محمد علی کی صورت

داڑھی، عبا، چھڑی سے بہت ملتا جلتا ہے، وہ حادثہ اس تصور سے تعلق رکھتا ہے۔

اب محمد علی کی زبان سے باقی کہانی سنئے:۔

"راستہ میں، بیرج ہوٹل ملا، وہاں موٹر رکی، اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا "خانم ساماں" کی تلاش کی گئی، ایک میم صاحبہ جو غالباً مالکہ تھیں، نکل آئیں، پہلے تو چاء دینے کا وعدہ فرمایا، لیکن جب میں آگے بڑھا، اور میں نے پوچھا،

کیئے کچھ اور بھی ہمت ہوگی؛

لنچ (بھی) اب تک نہیں کھایا ہے، تو انہوں نے گھبرا کر چاء دینے سے بھی انکار کر دیا، خیال ہے کہ انہیں "شیخ" سے خوف آیا، کہ کہیں "شیخ" اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لیجائے؟ یا کہیں مالکہ کا مالک ہی نہ بن بیٹھے؛"

اسی سلسلہ میں، چند سطروں بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

"میں نے دو تین ہی دن ہوئے وہ فلم دیکھا "THE SHEIKH,S SON" عنوان ہے، اور جس میں "شیخ زادہ" کا پارٹ تھا۔

ان فلموں کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں اگر ان ممالک والے اس

اندیشہ سے متردد ہوں، کہ اگر "شیخ زادوں" کی دراز دستیاں یہ ہیں تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں کیسی ہوں گی؟"

(۱۹ر اگست ۱۹۲۸ء)

سردار اقبال علی شاہ

سردار اقبال علی شاہ کے نام سے وہ حضرات جو اخبارات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں یقیناً ناواقف نہ ہوں گے، سردار صاحب کی پُر اسرار زندگی، اب تک ایک معمہ ہی ہے، لندن کے انڈیا آفس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سردار صاحب کی خدمات سے خاصا فائدہ اٹھایا۔

محمد علی سردار صاحب سے اپنی وجوہ سے نالاں بلکہ بیزار، اور متنفر تھے، اس لئے انہوں نے اپنے کریڈ میں موصوف کو ملازم رکھنے سے انکار کر دیا۔

علاج کے سلسلہ میں جب محمد علی لندن پہنچے تو سردار اقبال علی شاہ بھی وہاں تھے، دونوں میں ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا، کیونکہ سردار صاحب علی برادران کے خلاف لندن کے اخبارات میں برابر پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے، لیکن ایک روز محمد علی کو سردار صاحب نے ٹیلیفون کیا، اس ٹیلیفونی گفتگو کی روداد خود محمد علی کی زبان سے سُنئے:۔

"سردار:۔ مولٰنا السلام علیکم، معاف فرمایئے گا، میں نے آپ کو تکلیف دی۔

محمد علی:۔ وعلیکم السلام۔

سردار:۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا، میں سمجھتا تھا، کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرہ میں ہے۔

محمد علی:۔ ارشاد فرمایئے۔

سردار:۔ فرمایئے آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟

محمد علی:۔ جی نہیں!

سردار:۔ امید ہے آپ نے میرا قصور معاف کر دیا ہو گا۔

محمد علی:۔ جی نہیں۔

سردار:۔ آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے۔

محمد علی:۔ مگر میرا دماغ بالکل تنگ نہیں ہے۔

سردار:۔ کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

محمد علی:۔ جی نہیں۔

سردار:۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، کہ امید ہے آپ نے میرا قصور معاف کر دیا ہو گا!

محمد علی:۔ اور میں بھی پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جی نہیں!"

اس کے بعد میں نے ان ذات شریف کو ان کے

تمام مضامین یاد دلائے، اور کہا میں تنگ دل نہیں، لیکن ضعیف الدماغ بھی نہیں ہوں کہ ایسے پاجیوں سے دھوکا کھاؤں، مجھے تعجب ہے کہ برطانیہ کے ایسے گرگوں کو جو جاسوسی کرتے پھرتے ہیں، کیسے اتنی ہمت ہوئی، کہ مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں؟ اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں؟

میں نے کہا کہ اب سلسلہ کو ختم ہونا چاہئے، اور میں نے ٹیلیفون کو فوراً منقطع کر دیا!"

(۱۹ راگست ۱۹۲۶ء)

محمد علی کی شوخ طبعی، زندہ دلی، اور ظرافت کی آن ہر حالت میں قائم رہتی تھی!

باب (۱۳)

لطیفے!

مسلمانانِ ہند کی وہ محبوب شخصیت جسے دنیا محمد علی کے محبوب نام سے جانتی ہے، ایک جامع الصفات ہستی تھی، ایسے لوگ فطرت بہت کم پیدا کرتی ہے، جو ایک ہی وقت میں بہت کچھ ہوں، لیکن محمد علی انہی کم لوگوں میں ایک یگانہ فرد تھا، وہ ایک باتدبیر ماہر سیاست تھا، وہ انگریزی کا ایک بہترین انشاء پرداز تھا، وہ اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا، وہ ایک مانا ہوا صحافی تھا، اور ان سب ملکات و فضائل کے ساتھ ساتھ وہ ایک خوش طبع، بذلہ سنج اور لطیفہ گو بھی تھا، وہ جب تفریح و تفنن پر اپنی توجہ مبذول کرتا تھا تو ایسے ایسے لطیفے بیان کرتا تھا، ایسی تلمیحیں ایجاد کرتا تھا، ایسے ایسے نکتے پیش کرتا تھا کہ سُننے اور پھڑک اُٹھتے۔

محمد علی کے لطائف اگر جمع کئے جائیں، تو وہ بجائے خود ایک

طویل و ضخیم کتاب بن سکتے ہیں، لیکن اول تو ان میں سے سب محفوظ و منضبط نہیں، اور جو ہیں، وہ زیادہ تر شخصیتوں سے متعلق ہیں، اسلئے ان کی وفات کے تیو سال بعد بھی، ان کا بے محابا اظہار بزم و انجمن کے انقباض و تکدر کا باعث ہو سکتا ہے، لیکن محمد علی کے "مطائبات" کا مرتب، انہیں یکسر نظر انداز بھی نہیں کر سکتا، لہذا، مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو:-

محمد علی والیٔ ایران

مسٹر ضیاء الدین برنی کا بیان ہے:-

"مسجد کانپور کے ایجی ٹیشن کے زمانہ میں ایک مرتبہ علامہ شبلی مرحوم دہلی تشریف لائے، مولنا محمد علی نے شب کی دعوت ان کے اعزاز میں کی، بہت سے اصحاب مدعو تھے، سب کی فرمائش سے علامہ موصوف نے اپنی چند رباعیات سنائیں، جو سب کی سب کانپور کے واقعۂ ہائلہ سے متعلق تھیں۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے مولنا محمد علی کی مساعی کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا، جو وہ کانپور کی مسجد کی بحالی کے لئے کر رہے تھے، پھر چند تاریخی مثالیں پیش کر کے فرمایا کہ میں نے جن جن اشخاص کے ناموں میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھا ہے، انہیں ہمیشہ ممتاز

پایا۔

محمد علی نہایت خاموشی سے پہلے تو اپنی تعریف سنا کئے، پھر یوں گویا ہوئے، "محمد علی والیٔ ایران کو شاید آپ بھول گئے!"

حالت یہ تھی کہ حاضرین ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"خربوزہ"!

مولنا عبدالماجد صاحب دریا بادی ایک لطیفہ کی روایت فرماتے ہیں:-

"حکیم اجمل خاں مرحوم نے ایک بار خلافت کمیٹی کی مجلس مرکزیہ کے جلسہ کے موقع پر رہنمایان خلافت کو اپنے ہاں مدعو فرمایا، محمد علی بھی تھے، دوسرے رہنمایان خلافت بھی، اور بعض احرار پنجاب بھی،

حکیم صاحب نے مہمانوں کی تربوز سے تواضع فرمائی، تمام حاضرین نے اس دعوت شیراز سے لطف اٹھایا، لوگ تربوز کی تعریف کرتے، اور اسے مزے لے لے کر کھانے لگے، ایک صاحب نے فرمایا، دہلی کے تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں۔

محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست اور لیڈر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "لیکن پنجاب کے "خر" بوزے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"پینے" کی دیر

ایک مرتبہ ایک سخت نزاع کے موقع پر، ایک مختصر جلسۂ شوریٰ منعقد تھا، موضوع بحث ایسا مختلف فیہ مسئلہ تھا کہ گفتگو بڑھتی گئی، رات بڑھتی گئی، مگر اختلاف کم نہ ہوا، آخر ہندوستان کے ایک مشہور 'امام سیاست' کھڑے ہوئے، انہوں نے تحریک فرمائی کہ چونکہ رات زیادہ ہو چکی ہے، اور کھانے کی دیر بھی ہو رہی ہے، اس لئے یہ جلسہ اب ملتوی کر دیا جائے۔

محمد علی نے 'تائید کی' اور فرمایا،

"اب جلسہ ملتوی ہو جانا چاہیے، کھانے کی دیر بھی ہو رہی ہے، اور "پینے" کی دیر بھی ہو رہی ہے، اس مصروفیت کے بعد کچھ اکل و شرب" بھی ہونا چاہیے"۔

بلندی و پستی

سیاسیات میں محمد علی "نو چینجر" تھے، وہ کسی تبدیلی، اور مسلک

میں کسی تغیر کے حامی نہیں تھے، وہ مجالس آئین ساز کی شرکت کو غیر ضروری سمجھتے تھے، لیکن اخبار نویس بھی تھے، اس لئے کبھی کبھی کسی اہم موقع پر ایک تماشائی، اور "ہمدرد" کے ایک رپورٹر کی حیثیت سے اسمبلی کی پریس گیلری یا وزیٹرس گیلری میں چلے جاتے تھے، کچھ دیر بیٹھتے تھے، کارروائی دیکھتے تھے، رپورٹ لیتے تھے، اور چلے آتے تھے۔

ایک بار وہ اوپر گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے، نیچے سے ایک سوراجی دوست نے محمد علی سے کہا:۔

"جب یہاں تک چلے آئے ہو تو دو قدم اور بھی، آؤ، ہماری جماعت میں باقاعدہ شریک ہو جاؤ؟"

محمد علی نے کہا:۔

"میں آپ کی جماعت میں کیسے شریک ہو سکتا ہوں، میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں۔"

جس نے بھی یہ لطیفہ سنا پھڑک گیا!

قانونی مقاطعہ

۱۹۲۷ء کی مدراس کانگرس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگرس کا نصب العین "مکمل آزادی" منظور کرانے کے لئے ایک تجویز پیش کی محمد علی نے اس کی پُرزور تائید کی۔

پنڈت مدن موہن مالوی نے اس تجویز کی مجلس مضامین میں سخت

مخالفت کی، محمد علی نے بار بار دوران تقریر میں ان کے خیالات کی تردید کی، مالوی جی نے ملک معظم کا نام لیکر اپنی تجویز کو بہت زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی۔

محمد علی جانتے تھے، برطانوی آئین و دستور میں اصل عامل پارلیمنٹ ہے، نہ کہ بادشاہ، محمد علی نے کہا، "ملک معظم کا وجود تو ایک "قانونی مغالطہ" ہے، اس کا آپ کیا ذکر کر رہے ہیں؟"

اس لطیفہ پر وہ اظہار پسندیدگی کیا گیا کہ مالوی جی کی آواز اس شورِ تحسین میں دب گئی، مالوی جی صحیح معنی میں اس وقت "طوطی" بنے ہوئے تھے، اور کانگرس کا پنڈال نقار خانہ!

آل مسلم پارٹیز

امرتسر میں ڈاکٹر کچلو نے ایک "آل مسلم پارٹیز کانفرنس" نواب اسمٰعیل خاں کی صدارت میں منعقد کی تھی، تاکہ مسلمان رہنماؤں کا نفاق و شقاق دور ہو سکے، اس میں اسلامی ہند کے اکثر سربرآوردہ زعمانے شرکت کی تھی، علی برادران بھی رونق افروز تھے،

• دوران تقریر میں مولٰنا شوکت علی نے کہا:۔

"میں محمد علی کے متعلق کچھ نہیں کہتا، یہ تو بعض اوقات بد تمیزی کی بات بھی کر دیا کرتا ہے۔"

اس پر ایک صاحب نے جناب صدر کو توجہ دلائی، صدر نے

"حکم" دیا کہ اپنے الفاظ واپس لیجئے، شوکت صاحب نے کہا، میں محمد علی سے معافی مانگتا ہوں، آواز آئی کہ "مولٰنا محمد علی" کہئے، مولٰنا شوکت علی نے پریشان ہو کر کہا "اچھا بھائی، میں مولٰنا محمد علی سے معافی مانگتا ہوں"۔ اس رد و قدح نے اجلاس میں ایک پُر لطف سماں پیدا کر دیا۔

مولٰنا محمد علی نے اٹھ کر صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ "حضرت میں آپ کا شکر گزار ہوں، کہ آپ نے کم از کم ایک آدمی کو تو مجھ پر سب و شتم کے تیر برسانے سے روک دیا!"

ایک جلسہ

"ہمدرد" کی نشاۃ ثانیہ کے بعد اس کی پہلی سال گرہ کے موقع پر محمد علی نے مشاہیر دہلی اور اپنی صحافتی برادری کو ایک پُر تکلف دعوت دی عملۂ ادارت کی طرف سے عارف ہسوی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مہمانوں کی طرف سے میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حکیم اجمل خاں مرحوم کھڑے ہوئے، انہوں نے فرمایا "خدا کرے، ایسی سال گرہ ہر تیسرے مہینے آیا کرے!"

محمد علی نے فوراً کہا "تو پھر اخبار کا سالانہ چندہ بھی اسی حساب سے وصول کیا جائے گا!"

اس پُر لطف جواب نے سب پر اہتزاز کی ایک کیفیت طاری کر دی۔

زنانی مجلس

محمد علی ایک بار خالص عربی وضع میں — عبا اور عقال کے ساتھ — اسمبلی تشریف لے گئے، اتفاقاً پنڈت مدن موہن مالوی سے ملاقات ہوئی، انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا "اخاہ! آپ ہیں؛ میں تو سمجھا بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لا رہی ہیں؟"

محمد علی نے فوراً جواب دیا "بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیر دل خاتون ہیں کہ اس "زنانی مجلس" (اسمبلی) میں آنا پسند نہیں کرتیں!"

کالا آدمی

مالوی جی سے مڈبھیڑ کے بعد، محمد علی آگے بڑھے، تو مسٹر پٹیل صدر مرکزی اسمبلی سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے اپنے کمرہ میں لیجا کر ایک بڑے انگریز سے محمد علی کا تعارف کرایا، اس عربی وضع میں محمد علی کو دیکھ کر انگریز بھی خاموش نہ رہ سکا، اس نے کہا:۔

"مولانا آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں!"

محمد علی نے کہا:۔

"اس حسن ظن کا شکریہ، لیکن جب بارہ برس تک میں بالکل انگریزی لباس استعمال کرتا رہا تو آپ میں سے کسی نے نہیں کہا "تم تو پورے انگریز معلوم ہوتے، بلکہ "کالا آدمی"

ہی آپ کی زبان پر رہا"

بیچارہ چُپ ہو گیا!

"بہتوں کا بھلا ہوگا"

اخبارات کی غیر ذمہ دارانہ صحافت پر تنقید کرتے ہوئے، ایک مرتبہ محمد علی نے فرمایا:۔

"لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں، جن کا اصول صحافت یہ ہے کہ "ایک پیسہ لوں گا، ایک گالی دوں گا" یا جن کی آمدنی کا ذریعہ ان کے گندے اشتہارات ہیں، جن کے پڑھنے ہی سے نہیں، بلکہ چھاپنے سے بھی "بہتوں کا بھلا ہوتا رہتا ہے"!

"بہتوں کا بھلا" والی تلمیح وہی حضرات خوب سمجھ سکتے ہیں، جنکی نظر سے وہ مشہور عام اشتہار "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا!" گزر چکا ہو!

خیریت مزاج!

کراچی میں جب محمد علی ماخوذ ہوئے، اور عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہوا، تو استغاثہ (حکومت) کی جانب سے گواہ گزر رہے تھے، محمد علی کا مسلک یہ تھا کہ عدالتی کارروائی میں حصہ نہ لیں، چنانچہ وہ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، اور خاموش تھے۔

ایک موقع پر عدالت نے استفسار کیا "آیا آپ گواہ پر کوئی جرح کرنا چاہتے ہیں؟"

محمد علی کھڑے ہو گئے، لوگ سنبھل کے بیٹھے کہ وہ اب گواہ پر جرح کریں گے، محمد علی وکیل نہیں تھے، لیکن ان کی مہارت قانونی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، لیکن محمد علی نے گواہ پر جرح کرنے کے بجائے اس کی "خیریت مزاج" دریافت کی، اور بیٹھ گئے۔

اس لطیفہ پر عدالت میں وہ قہقہہ پڑا کہ سارا ہال گونج اٹھا!

تحریف اسما

محمد علی اسما کے معنی میں خفیف سا تغیر کر کے ایک عظیم انقلاب، اور ایک مزیدار لطیفہ پیدا کر دیا کرتے تھے۔

لارڈ برکن ہیڈ کو وہ "بروکن ہیڈ" (شکستہ سر) فرمایا کرتے تھے۔

مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو ان کی ہندو نوازی کی وجہ سے وہ رام جی مکنداس" کہتے تھے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے، ان کے محبوب دوست مولانا عبدالماجد دریا بادی کو بڑی عقیدت تھی، جب ملاقات ہوتی، ضرور دریافت فرماتے "کہئے تھانہ دار صاحب کا مزاج کیسا ہے؟"

دہلی سے ایک اخبار نکلتا تھا، "ملت" اس کے ایڈیٹر کو مذاق میں "ملت فروش" کہتے تھے۔

"شوہر"

احباب کی ایک صحبت میں بحث چھڑی، تم تین بھائی ہو، دو شاعر ہیں ذوالفقار علی گوہر، محمد علی جوہر، اور شوکت علی؟

محمد علی نے ترنت سے جواب دیا، ان کے لئے بہترین ہم قافیہ تخلص "شوہر" ہی ہو سکتا ہے، یہ جواب سن کر حاضرین مجلس پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔

سوڈا

حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہاں، متعدد ہندو مسلم زعما تشریف رکھتے تھے، محمد علی بھی موجود تھے، حاضرین کی خدمت میں پان پیش کئے گئے۔

ایک صاحب کے متعلق عام خیال تھا کہ وہ بادہ نوش بھی ہیں، حکیم صاحب نے ان کی طرف پان بڑھاتے ہوئے پوچھا "آپ تمباکو تو نہیں کھاتے؟" انہوں نے فرمایا "میں بغیر تمباکو کے پان نہیں کھاتا!

محمد علی نے فوراً حکیم صاحب کو اپنا مخاطب بنایا، اور کہا "حکیم صاحب! اسی لئے میں سوڈا نہیں پیتا!"

محمد علی کہنے کو تو یہ کہہ گئے، لیکن حکیم صاحب سمیت حاضرین کیلئے یہ بڑے ابتلا کا وقت تھا، نہ پاس تہذیب سے وہ ہنس سکتے تھے، اور نہ ہنسی کا ضبط کرنا ممکن تھا، ادھر ان لیڈر صاحب کا یہ حال تھا کہ ایک رنگ آ رہا تھا، اور ایک جا رہا تھا۔

یہ لطیفہ میں نے، مولنا محمد عرفان مرحوم، سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی سے سنا تھا!

شریفے!

علی گڑھ سے محمد علی کو والہانہ شیفتگی تھی، وہ اکثر وہاں جایا آیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ، ایک دوست کے مکان پر وہ علی گڑھ میں ٹھہرے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڑھ کی برسراقتدار پارٹی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین، اور شیخ عبداللہ وغیرہ سے ان کے بڑے معرکے مقابلے ہو رہے تھے۔

شریفوں سے محمد علی کو بڑا شوق تھا، اتفاق سے اسی وقت صاحبزادہ کے ہاں شریفے آئے، انہوں نے محمد علی کو پیش کئے، انہوں نے یہ پیشکش قبول کی، اور باہر صحن میں، جہاں اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے، بڑی بے تکلفی سے شریفے کھانے لگے، شریفے کھاتے جاتے تھے، اور بیج وہیں زمین پہ پھینکتے جاتے تھے۔

ایک صاحب نے (جو مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے تھے) فرمایا،

"تم شریفے کھا کھا کر بیج یہیں پھینک رہے ہو، یہ کیا حرکت ہے؟"

محمد علی نے کہا "اس لئے، کہ شاید اُگ آئیں، علی گڑھ میں شریفوں کی بڑی کمی ہے!"

وہ صاحب تو دم بخود ہو گئے، اور حاضرین کا یہ حال کہ ہنسی کے مارے بے خود ہوئے جا رہے تھے۔

"ہریل"

جاڑوں کا زمانہ تھا، خلافت کی مجلس مرکزیہ کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ مولنا ظفر الملک صاحب علوی، علی برادران کے مسلک کے شدید مخالف تھے، اور پوری بیباکی سے اظہار اختلاف بھی کرتے تھے۔

اس اجلاس میں بھی مولنا ایک مخالف کی حیثیت سے شریک ہوئے ہرے رنگ کا ایک لبادہ پہنے ہوئے، اور غالباً سبز ہی رنگ کا کنٹوپ بھی زیب سر تھا۔

محمد علی یہ منظر دیکھتے، اور خاموش رہتے؟ انہوں نے اپنے ایک دوست سے، جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا، "آپ کو دیکھئے، ہریل بنے ہوئے چلے آ رہے ہیں!"

باب (۱۳)

منظر اور پسِ منظر

محمد علی کو منظر کشی میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، منظر کے ساتھ وہ "پس منظر" بھی بڑی خوبی سے پیش کرتے تھے، ایسے مواقع پر، واقعات کا تسلسل، حالات کا اتار چڑھاؤ، منطقی اور اصولی مباحث پر اصولی تبصرہ، سب ہی کچھ آجاتا تھا، وہ منظر اس طرح پیش کرتے تھے کہ پس منظر خود بخود اجاگر ہو جاتا تھا، وہ پس منظر، اس کمال سے مرتب کرتے تھے کہ منظر آنکھوں کے سامنے محسوس، اور مرئی صورت میں جلوہ گر ہو جاتا تھا، یہی ان کی انشاء پردازی، حسن بیان، اور شگفتگی کلام کا منتہا تھا، شوخی ـــ انداز بیان کی بھی، اور الفاظ کی بھی ـــ ساتھ ساتھ چلتی تھی، جس طرح بادشاہوں کے جلو میں، عزت و اقبال ساتھ ساتھ چلتے ہیں،

حسن کی سواری کے ساتھ بانکپن اور طرحداری ساتھ ساتھ چلتی ہے، امراء و رؤسا کے ساتھ، دبدبہ اور طنطنہ ساتھ چلتا ہے، یہ بات محمد علی ہی کے ہاں ملے گی، کہ ان کے حسن بیان کے پہلو بہ پہلو، خوشنما الفاظ، شگفتہ تراکیب، شوخی بیان، اور جدّتِ ادا کا قافلہ بھی گام فرسا نظر آئے گا، اور اس کوکبہ حشمت و عظمت کو دیکھتے ہی آپ پہچان لیں گے، کہ یہ اقلیم "معانی و بیان" کے فرماں روا، اور کشور کشا کی سواری ہے!

اب "باملاحظہ، باادب، ہوشیار، خبردار، نگاہ روبرو" کے نعرے ختم ہوتے ہیں، پردہ اٹھتا ہے، اور زبان و بیان کا شاہ جم جاہ جلوہ فرما ہوتا ہے!

سر فضل حسین اور سر جوزف بھور

ہندوستان کا کون سیاست آشنا شخص ہے، جو سر فضل حسین کے نام سے واقف نہ ہو؟ یہ وہ شخصیت تھی جو جب تک پنجاب میں رہی، تمام سر برآوردہ عناصر پر چھائی رہی، سر چھوٹو رام ہوں، یا سر سکندر حیات خاں، سر شفیع ہوں، یا سر ذوالفقار علی خاں، لالہ سر منوہر لال ہوں یا راجہ نریندر ناتھ، سب ہی اس کے حلقہ بگوش تھے، پھر جب وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر ہو کر فضل حسین، حکومت ہند کا رکن رکین بنا، تو یہاں بھی اسکے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ وہ وائسرائے نہیں تھا، لیکن وائسرائے بھی

وہی کرتا تھا، جو وہ چاہتا تھا۔

سر جوزف بھور بھی حکومت ہند کے محکمۂ تعلیمات کے پہلے سکریٹری رہے، پھر اگزیکیٹو کونسلر ہوگئے، انہوں نے اپنے دور میں بڑا نام کیا، اور اب بھوپال ہیں، نواب صاحب کے مشیر سیاسی بنے ہوئے ہیں۔

ان دونوں کی زندگی کا "منظرنامہ" محمد علی کا کھینچا ہوا، ملاحظہ ہو:۔

"جس وقت ۹۹-۱۸۹۸ء میں انگریزوں اور بور لوگوں سے جنوبی افریقہ میں جنگ ہو رہی تھی، اس زمانہ میں، میں ولایت میں تھا، اور میرے ساتھ دو اور ہندوستانی طالب علم میرے دوست اور ساتھی تھے، ایک پنجاب کے مسلمان، دوسرے پونہ کے ایک مرہٹہ عیسائی۔

میں آکسفرڈ میں پڑھتا تھا، اور میرے پنجاب کے مسلمان دوست کیمبرج میں، اور پونہ کے مرہٹہ عیسائی دوست پہلے آکسفرڈ آئے، پھر لندن ہی میں رہ گئے، ہم تینوں ایک ساتھ سول سروس کے امتحان میں بیٹھے، پونہ کے عیسائی دوست پاس ہوگئے، مگر ہم دونوں مسلمان فیل ہوگئے۔

خدا کی شان کہ پنجاب کے وہ مسلمان سر میاں فضل حسین آج وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبر ہیں، اور چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپے، دس آنے، آٹھ پائی، ماہوار پا رہے ہیں اور دوسرے عیسائی دوست، مسٹر (جوزف) بھور اس

محکمۂ (تعلیمات) کے سکریٹری ہیں، اور تین ہزار پانسو، ماہوار پاتے ہیں، لیکن ہم دہلی کے بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور لوگوں سے کھدّر پہننے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

لطف یہ کہ یہ دونوں صاحبان اس محکمہ میں ہیں جس کا تعلق جنوبی افریقہ سے ہے۔

ولایت میں بور لوگوں سے جنگ کے وقت یہ دونوں حضرات میری طرح انگریزوں کو کوسا کرتے تھے، یعنی مجھ ہی سے کسی طرح کم بور لوگوں کے حق بجانب ہونے کے قائل نہ تھے، اور انگریز جو کہہ رہے تھے کہ وہ (بور) ہندوستانی رعایا پر ظلم و ستم کرتے ہیں، اور انہیں جنوبی افریقہ سے نکالنا چاہتے ہیں، اس کے نہ یہ دونوں قائل تھے، نہ میں تھا۔

معلوم نہیں، اب جبکہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں پر، (ایشیاٹک بل کے ماتحت) یہ ظلم و ستم ہو رہا ہے، تو اب بھی یہ حضرات اسی طرح حکومت کو کوستے ہوں گے یا نہیں؟"

(۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

یہ حضرات حکومت کو کوستے ہوں یا نہ کوستے ہوں لیکن اس میں

کوئی شبہ نہیں، یہ مضمون پڑھ کر، محمد علی کو ضرور کوسنے لگے ہوں گے۔

بڑے بھیّا

محمد علی کو اپنے بڑے بھائی (BIG BROTHER) شوکت علی سے عشق تھا، کبھی کبھی وہ اپنے موقلم سے "بڑے بھیا" کی تصویر بھی کھینچتے ہیں۔ شوکت علی کے چند مرقعے، جو محمد علی کے موقلم کے رہین منت ہیں، آپ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

"برادر بزرگ (BIG BROTHER) کے متعلق جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تپ محرقہ میں مبتلا ہیں تو راقم الحروف کلکتہ کی خلافت کانفرنس کی صدارت سے بھی باز آچکا تھا، مگر برادر بزرگ اپنے چھوٹے بھائی کے لئے ایسے حلیم الطبع اور نرم دل نہیں ہیں، جیسے دوسروں کے لئے، اور ایسے موقعوں پر ان کی بے دردی، بسا اوقات یہ ضرب المثل یاد دلا دیتی ہے کہ "سگ باش برادر خورد مباش"!

چنانچہ راقم الحروف کی مرضی اور خواہش کے خلاف انہوں نے مجبور کیا کہ وہ کلکتہ کی (خلافت) کانفرنس میں شرکت کرے، اور بحالت خوردی، راقم الحروف کے لئے چارۂ کار ہی کیا تھا؛ لیکن ایسی اطاعت گزاری و فرمانبرداری کُتّے کے ضبط و تحمل کی بھی کبھی کبھی حد آجایا کرتی ہے،

اسی بنا پر جب برادر بزرگ نے برادر خورد کو اپنی اس علالت کی حالت میں یہ حکم دیا کہ وہ برہا بھی جائے، تو اس کے تحمل و ضبط کی آخری حد آگئی، اور اب اس نے "انکار صاف" کے دانت نکالنے شروع کئے۔

ہندوستان کے اندر اندر جانے تک تو خیر کچھ بات نہ تھی، لیکن بڑے بھائی کو ایک خطرناک مرض میں مبتلا چھوڑ کر بیرون ہند جانا کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا، اس لئے نہ برادر بزرگ کی دھمکیاں کام آئیں، اور نہ منت و سماجت، اگرچہ ان دونوں حربوں کے استعمال میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے"۔

(۱۸؍ اگست ۱۹۲۵ء)

مولانا شوکت علی راقم الحروف کے بڑے بھائی ہیں، لیکن اگر بعض مہربان دوستوں کے اس خیال کو مان لیا جائے تو راقم الحروف ان چند ہستیوں میں سے ہے جو پوپ (ایک انگریزی شاعر) کے قول کے مطابق "ترکوں کی طرح کسی بھائی کو تخت کے نزدیک نہیں آنے دیتیں"!

راقم الحروف اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کو کتنا ہی چھوٹا بنانا چاہے، مگر ان کی ہستی اس قدر بڑی ہے کہ کسی طرح وہ ایک معمولی انسان کے درجہ پر نہیں آسکتے، اور

اور یہ خیال جس قدر ان کے جسم کے متعلق صحیح ہے، اس سے کچھ زیادہ ان کی روح کے متعلق درست ہے۔

ایک ایسا شخص جو چار من پکے کی لاش کو روزانہ چھ چھ مرتبہ دفتر خلافت کے سہ منزلہ بالاخانہ پر کھینچ کر لے جایا کرے، اور روزانہ صدہا دوکانوں کا چکر لگایا کرے، (صدہا دو دو آنہ دہی) دوکان سے لیکر دو یا تین روپیہ (فی) دوکان تحصیلا کرے، یقیناً ایک متحرک پہاڑ ہے، اور یہ ان کی قوت ہے، جو اس پہاڑ کو متحرک کرتی ہے۔

جس وقت سب مایوس ہو جاتے ہیں، اس وقت تنہا وہی ایک ہستی ہے جو ہم سب کی مردہ امیدوں میں از سرِ نو جان ڈالا کرتی ہے،

یہ بالکل درست ہے کہ ہم سب نے خلافت کے لئے کام کیا ہے، لیکن اگر ہر معاملہ کی تہ میں سچائی کی تلاش کی جائے تو جس طرح فرانس کے خود مختار بادشاہ لوئی چہاردہم نے اپنے قانونی تجبر طریقے سے جو "قوانین سلطنت" کا بارہا رد کر کرتا تھا، کہدیا کہ "سلطنت! وہ تو میری ذات ہے!" اسی طرح شوکت بھی کہہ سکتے ہیں کہ تحریک خلافت تو میرا نام ہے، وہ کو ریولینس کی طرح کہہ سکتے ہیں کہ "یہ کام تن تنہا میں نے کیا ہے!" کیونکہ تنظیم خلافت کی ابتدا بھی وہی

اور انتہا بھی وہی ہیں۔

فی الحقیقت انہی نے اس تحریک کو شروع کیا، اور آج بھی جب کہ سیٹھ چھوٹانی کی بد دیانتی اور شدھی و سنگٹھن کا مسلمانوں پر اثر دیکھ کر پس پردہ کام کرنے والے ہاتھ سے بے خبر لوگ یہ کہہ رہے ہیں، کہ تحریک خلافت کا خاتمہ قریب آ گیا ہے شوکت نے تن تنہا گاڈرین کی طرح اس تمام وزن کو اپنے مضبوط اور خم نہ کھانے والے بازوؤں پر سنبھال رکھا ہے۔

وہ خواہ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں، مگر ایک مضبوط اور رفندی فقیر ضرور ہیں، اور ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر لوگوں کو لوٹنے کا راز کچھ انہیں کو معلوم ہے!"

(۲۴ اگست ۱۹۲۵ء)

یہ سراپا ایک عاشق زار بھائی نے، ایک محبوب بھائی کا کھینچا ہے! لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس مدحیہ قصیدہ منثور میں ذرا بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے؛ شوکت علی کی زندگی، شوکت علی کے کردار، اور شوکت علی کی محبوب شخصیت کا یہ نہایت کامیاب مرقع ہے! ایک ایک رواں دیکھ لیجئے!

"میں نے علی گڑھ کے سب سے بڑے عاشق، اور سب سے بڑے کھلاڑی سے اپنے بھائی شوکت صاحب سے التجا کی کہ

وہ فرلو لیکر اس (علی گڑھ کی مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے) کام کو اپنے ہاتھ میں لیں، انہوں نے دو سال کی فرلو لی، اور پھر کبھی گورنمنٹ کی ڈیوٹی پر نہ گئے، بلکہ ملک و ملت کے چاکر بن گئے۔

جس طرح انہوں نے طلبائے سابق کی ایسوسی ایشن کو زندہ کیا، اسی طرح انہوں نے دو برس سارے ہندوستان میں گھوم کر مجوزہ مسلم یونیورسٹی کی جنین کو مادر کالج کے بطن سے نکالا۔

لیکن علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کا اس کے اس سب سے بڑے عاشق کے ساتھ کیا طرز عمل رہا؟ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ وہ اس کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوں، اور جب نواب عماد الملک مرحوم نے انہیں انتخاب کے لئے منظور فرمایا تو صرف اس بنا پر ارباب بست و کشاد نے انہیں منتخب نہ ہونے دیا کہ انہوں نے "البشیر" میں ایک مضمون لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں، ٹرسٹیوں کا انتخاب جمہور (مسلمین) کے ہاتھ میں ہو اس لئے باوجود اس کے کہ اب تک یہ اصلاح کالج کے قواعد میں نہیں ہوئی ہے، میں مسلمانوں کو اطلاع دیتا ہوں کہ میں انتخاب کے لئے نامزد کیا گیا ہوں، اگر وہ (مسلمان) یہ رائے ظاہر کریں گے، کہ

شوکت علی اس کا مستحق نہیں ہے، تو باوجود کامیابی کی امید کے میں اپنا نام واپس لے لوں گا۔

تمام مسلمانوں سے اظہار رائے کی خواہش کرانی، ارباب بست و کشاد کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا (چنانچہ) وہ (شوکت علی) اس سال منتخب نہیں کئے گئے۔

ایک بار ایجوکیشنل کانفرنس کے دوران میں ان سے ضبط نہ ہو سکا، اور ایک نہایت ناشائستہ حرکت فوری اشتعال کے باعث ان سے سرزد ہو گئی۔

ان کا ٹرسٹیوں کی جماعت سے اخراج وہی جماعت کر سکتی تھی مگر اس کے لئے وقت اور کثرت رائے دونوں کی ضرورت تھی، طلباء سابق کو نہ کسی کے داخلہ کا اختیار تھا، نہ اخراج کا، لیکن ارباب بست و کشاد نے طلباء سابق کا ایک بے قاعدہ جلسہ اسی وقت منعقد کیا اور ان کی (شوکت صاحب کی) غیر حاضری میں کثرت رائے سے یہ تجویز منظور کی کہ ان سے کہا جائے، وہ خود استعفا دیدیں۔

یہ مطالبہ خلاف قاعدہ بھی تھا، اور اخلاقاً ناروا بھی، لیکن خود میں نے ان سے جا کر عرض کیا کہ ہم کثرت رائے کے ایک بے قاعدہ اور ناروا فیصلہ کے آگے بھی گردن جھکا دیں گے تو دنیا دیکھ لے گی کہ ہم طلبائے سابق کو حقوق دلانے کے کیسے

پرجوش، اور پرخلوص حامی ہیں؟

چنانچہ شوکت صاحب نے اس فیصلہ پہ اپنا سر جھکا دیا اور فوراً استعفا داخل کر دیا۔

ایک بار جب شوکت صاحب کا تبادلہ ایٹہ اور علی گڑھ کو ہوا تو لفٹنٹ گورنر سے کہہ کر انہیں بنارس بدلوا دیا گیا جس کی اطلاع پا کر ایک کھلنڈرے نے ان سے کہا ؎

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں تمہیں بنارس میں

اس پر بھی شوکت علی نے بنارس سے "اولڈ بوائز" رسالہ نکالا، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں آدھی تنخواہ پر فرلو لے کر مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرایا، اور ۳۰ لاکھ کل رقم میں سے ۲۰-۲۵ لاکھ خود جمع کیا"۔

یکم مئی ۱۹۳۶ء

"علی گڑھ کی جتنی ٹھوس خدمت شوکت علی نے کی، کسی "اولڈ بوائے" نے نہیں کی، اور اس کا جو صلہ انہیں برسر اقتدار پارٹی کی طرف سے ملا، اس کے لئے محمد علی کا مذکورہ بالا بیان کافی ہے!

سرسید احمد خاں!

محمد علی، کانگرس کے ستونوں میں سے ایک ستون تھے، حکومت کے

باغی تھے، موالات کے مخالف تھے، اپنی سرکشی اور بغاوت پر انہیں ناز تھا ٹوڈیوں، سرکار پرستوں، اور حکومت کے نیاز مندوں کے سخت مخالف تھے۔

سرسید کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ حکومت پرست تھے، لیکن محمد علی کا دل سید احمد خاں کی عقیدت سے سرشار ہے، وہ اس سرکار پرست بوڑھے کو خضر راہ سمجھتے ہیں، وہ اسے سفینۂ ملت کا ناخدا تسلیم کرتے ہیں، کیوں؟ سنیئے:-

(۱۸۵۷ء کا) غدر کیا تھا، ہندو اور مسلمان دونوں کو اس کی پاداش اٹھانی پڑی، تاہم کی تمام مسلمانوں کو، جو انقلاب غدر کے بعد واقع ہوا، اس کا اثر مشرقی اسلام پر فرانس کے انقلاب سے کسی طرح کم نہ تھا، جو اونچے گنے جاتے تھے وہ نیچے ہو گئے، اور جو نیچے گنے جاتے تھے، وہ اونچے ہو گئے۔

سرسید کے خاندان کا قلعۂ معلی (مغلیہ خاندان کے آخری مسند نشین بہادر شاہ کا قلعۂ معلی) سے دیرینہ تعلق تھا، لیکن انہوں نے انگریزوں کی نوکری کی، جس کے باعث ان کے گھر کی ایک بڑی بوڑھی نے مرتے دم تک ان کی صورت نہ دیکھی۔

غدر میں انہوں نے نہ صرف یہ کیا کہ باوجود انگریزوں کے فرار اور روپوش ہو جانے کے اپنے فرائض منصبی اسی طرح

ادا کئے، گو باحکومت بدستور قائم ہے، اور کاروبار سلطنت میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر انہوں نے بہت سے انگریزوں اور میموں کی جانیں بھی بچائیں۔

لیکن جب صلہ کے طور پر انہیں گورنمنٹ نے کئی لاکھ روپیہ کی ایک مسلمان کی جائداد دینی چاہی، جس سے وہ بغاوت کا الزام لگا کر چھینی گئی تھی، تو سرسید نے اس بنا پر ایسا صلہ لینے سے انکار کر دیا کہ "میں اپنے ایک بھائی کے گوشت پوست خون، اور استخوان سے اپنا پیٹ بھرنا نہیں چاہتا!"

یہی نہیں بلکہ انہوں نے عین اس زمانہ میں جب مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی، "اسباب بغاوت ہند" نامی رسالہ تیار کیا، جس میں غدر کے تمام پوست کندہ حالات کو بیان کر دیا اور بتایا کہ انگریزوں کی ہندوستانی شرفا کے ساتھ بدسلوکی اور مشنریوں کا حد سے زیادہ جوش تبلیغ کس طرح غدر کے محرک ہوئے۔

دوستوں نے لاکھ منع کیا کہ یہ نہایت نازک وقت ہے، حق و ناحق کو آج کوئی نہیں پوچھتا، تمہاری ساری وفاداری اکارت جائے گی، اور تم خود باغی سمجھے جاؤ گے، لہٰذا اس جسارت سے کام نہ لو، مگر انہوں نے ایک نہ مانی، اور اس رسالہ کو چھپوا ہی دیا، دو رکعت نماز نفل ادا کر کے

اور دیر تک سربسجود اور دست بدعا رہ کر انہوں نے پانسو نسخوں میں سے ۴۹۸ انگلستان کے ممبران پارلیمنٹ اور دیگر زعما کے پاس خود ڈاک خانے جا کر رجسٹری کرا کے روانہ کئے، ایک گورنمنٹ ہند کو ارسال کیا، اور ایک اپنے پاس رکھا۔

اسی طرح آگرہ کے دربار میں جب انہوں نے دیکھا کہ انگریزوں کی نشست کا علٰحدہ انتظام کیا گیا ہے، اور ہندوستانیوں کو علٰحدہ بٹھایا گیا ہے، تو باوجود سرکاری ملازم ہونے کے دربار چھوڑ کر چلے آئے!

(۵ رجنوری ۱۹۲۷ء)

اس آئینہ میں سید احمد خاں کی شبیہ مبارک اس مرقع سے کتنی الگ نظر آتی ہے جو ظن و تخمین کے قلم سے کھینچا گیا ہے؟

رمزے میکڈانلڈ

انگلستان کے سیاستدانوں میں مسٹر رمزے میکڈانلڈ کا پایہ بہت بلند تھا، وہ لیبر پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں انہوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا، اور وزارت عظمیٰ کی تشکیل کے وقت مختلف پارٹیوں کا ایک اتحادی گروپ بنا لیا تھا۔

وہ کئی برس تک برطانیہ کے وزیر اعظم رہے، وزارت عظمیٰ سے

پہلے وہ ہندوستان کے بڑے ہمدرد تھے، اور وزارت عظمیٰ کی کرسی پر متمکن ہونے کے بعد،

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد

کے مصداق ہوگئے، ایک زمانہ تھا، کہ وہ ہندوستان کے اتنے ہواخواہ تھے کہ انہوں نے ہندوستان پر جو کتاب لکھی تھی، وہ ہندوستان میں ممنوع الاشاعت قرار دی گئی تھی، پھر وہ زمانہ آیا کہ متعدد "کالے قوانین" ان کی مرضی اور ایماء سے ہندوستان میں نافذ ہوئے، اور ہندوستان کے حریت تاب اور آزادی نواز طبقہ پر، وہ تمام عنایتیں کی گئیں، جو کسی کنزرویٹو وزیر اعظم کے عہد میں بھی مستحسن نہ سمجھی جاتیں۔

ان مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کا مرقع محمد علی کا قلم شگفتہ رقم یوں کھینچتا ہے:۔

"میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کو ۱۹۱۳ء سے جانتا ہوں، (یہ) لارڈ اسلنگٹن والے پبلک سروس کمیشن کے رکن (ہوکر) ہندوستان تشریف لائے تھے، میں نے (بھی) لکھنؤ جاکر شہادت دی تھی، اور انہوں نے "کامریڈ" کو اپنے بالالتزام پڑھنے کا مجھ سے سوالات کے وقت ذکر کیا تھا اور میری شوخیٔ تحریر کی بہت کچھ تعریف فرمائی تھی۔

جس دن کانپور کی مسجد شہید ہوئی، میں دہلی سے بمبئی جارہا تھا میں نے ایک تار مسٹر میکڈانلڈ کے نام دیا کہ ہمارے ساتھ

عمال حکومت نے یہ ظلم کیا ہے، آپ پارلیمنٹ میں اس سوال کو پیش کریں۔

تار کا جواب نہ مجھے تار سے ملا، نہ خط سے، نہ پارلیمنٹ میں اس مرد خدا نے کوئی سوال ہی کیا، جب مسٹر جسٹس وزیر حسن اور میں ستمبر ۱۹۱۳ء میں اسی لئے انگلستان گئے، تو یہ بھی مجھ سے ملنے ہماری قیام گاہ پر آئے، میں نے تار کا جواب نہ آنے کی شکایت کی تو فرمایا کہ بھئی واقعہ یہ ہے کہ تمہارا نام اس قدر عام ہے کہ میں کچھ نہیں سکا، تار تم نے بھیجا ہے یا کسی اور محمد علی نے، اور بھیجا بھی بمبئی سے گیا تھا، اگر دہلی سے آیا ہوتا تو میں سمجھ جاتا کہ تمہیں نے بھیجا ہے، مجھے اس جواب کو سنکر تعجب بھی ہوا، اور غصہ بھی آیا، اس لئے کہ میں نے تار میں صاف لکھ دیا تھا کہ محمد علی ایڈیٹر کامریڈ اس کا ارسال کرنے والا ہے۔

جب آپ نے دیکھا کہ یہ چال کارگر نہ ہوئی، تو فرمایا کہ ہاں میں بھولا، واقعہ یہ ہے کہ تمہارا تار ملا تو میں نے احتیاط سے اپنی ڈاک کے ساتھ رکھ لیا، کہ اس کے متعلق مزید حالات دریافت کرکے کارروائی کرونگا، مگر تمہارا تار دوسرے تاروں کے نیچے کچھ اس طرح دب گیا کہ آج تک دبا ہوا پڑا ہے۔—

میں اسی دن سمجھ گیا کہ یہ کس قماش کے بزرگ ہیں۔

سات برس بعد جب میں وفد خلافت کو لیکر یورپ گیا، تو اس

وقت نہیں اتنی فرصت کہاں تھی، کہ ریمزے میکڈانلڈ صاحب کو ڈھونڈھ نکالتے؟ البتہ ہم نے حزب عمال (لیبر پارٹی) کو (اپنے آنے کی) باضابطہ اطلاع دیدی تھی، ہم نے درخواست کی کہ ہمیں حزب عمال کی سالانہ کانفرنس میں شرکت کے ساتھ شرائط صلح کے متعلق اظہار خیال کا موقع دیا جائے، لوگوں نے کہا اب تو پروگرام طے ہو چکا، تاہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سکریٹری ہیں، ان کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو اب بھی پروگرام میں وقت نکال لیں، وہ تو تمہارے دوست ہیں، ان سے کہو وہ ضرور تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے۔

میں خوش خوش حاضر ہوا، میں نہیں کہہ سکتا اس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا، ایک منٹ اس کو رکنا گوارا نہ تھا، راستہ چلتے چلتے فرمایا، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام پہلے ہی پُر ہے، اس لئے وقت نکالنا مشکل ہے۔

مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا، مگر رنج کے علاوہ حیرت تعجب کی انتہا نہ رہی، جب مجھے اس انکار کا اصلی سبب معلوم ہوا، آپ سے نہ رہا گیا، فرمایا، تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا تم مجھ سے آج ملتے ہو؟ اتنے دن سے کہاں تھے؟

میں نے کہا، میں لندن سے باہر تھا، اور (پھر) پارلیمنٹ

والوں سے ملنا ضروری تھا، اس لئے ملاقات نہ ہو سکی، فرمایا تم ان ناکارہ لوگوں کے پاس گئے، اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا؟ آج مجھے یاد فرمایا؟ میں تمہارے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتا۔

جو شخص ایک دن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اس قدر کم ظرف اور تنگدل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی!"

(۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء)

اب بھی جو لوگ ان سطروں کو پڑھیں گے، وہ یقیناً غرق بحر حیرت ہو جائیں گے!

جنرل ڈائر!

جلیانوالا باغ!

آج بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اب بھی کانگرس کی طرف سے ہر سال "یوم جلیانوالا باغ" منایا جاتا ہے، اس باغ میں نہتے، اور بے گناہ مجمع پر، اس شخص نے، تحریک آزادی کے شباب کے زمانہ میں گولیاں چلائی تھیں، اور اپنے اس فعل شنیع پر کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔

محمد علی اس کا سراپا بیان کرتے ہیں:۔

"جنرل ڈائر! یہ غرور کا مجسمہ، اور تکبر کا پتلا، فوج کے دستوں کو لیکر نکل کھڑا ہوا، جلیانوالہ باغ میں پہنچکر اس نے

ان دستوں کو گولی چلانے کے لئے مناسب موقع پر کھڑا کیا، اور باوجود دیکھ یہ اور اس کی ساری قوم ایک چھوٹی سی چیونٹی میں جان ڈالنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی، اس نے ہزاروں انسانوں کی جان لینے کی پرواہ نہ کی، فوراً فوجی دستوں کو گولی چلانے کا حکم دیدیا، اور اس وقت تک برابر گولی چلواتا رہا، جب تک گولی چلانے کے لئے کارتوس باقی رہے۔

یہی وہ شخص تھا، جس نے صرف ایک میم کے پٹ جانے کا بدلہ اس طرح لیا کہ جس گلی میں اس پر حملہ کیا گیا تھا، اس میں سے گزرنے کی یہ شرط مقرر کردی کہ جو وہاں سے گزرے زمین کے کیڑوں کی طرح پیٹ کے بل رینگتا ہوا گزرے، حالانکہ انسان کے پیدا کرنے والے نے اسے اس طرح بنایا تھا کہ اس کا سر آسمان کی طرف اٹھا رہے۔

جلیانوالے باغ میں بہت سے حاضرین نے بجائے اپنے سینے کے اپنی پیٹھ پر گولیاں کھائیں، اور خداوند کریم کی طرف سے نہایت اچھے قوائے جسمانی عطا کئے جانے پر بھی ہزاروں میں سے کسی نے بھی جنرل ڈائر کے سو سپاہیوں پر دھاوا کرکے ان کی بندوقیں چھیننے کی کوشش نہ کی، اور ایک شخص نے بھی، امرتسر کی اس گلی میں جہاں ایک میم پر حملہ کیا گیا تھا

پیٹ کے بل رینگنے سے انکار نہ کیا!"

(۴ر اگست ۱۹۲۶ء)

کیا یہ تصویر اس قابل نہیں ہے کہ اسے فریم میں لگا کر، ہر ہندوستانی اپنے گھر میں آویزاں کرے؟

سر محمد شفیع!

سر محمد شفیع مرحوم ہندوستان کے ارباب سیاست میں ایک بلند رتبہ پر فائز تھے، ان کی زندگی میں بھی وہی اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے، جو ہوا کے رُخ پر چلنے والے سیاست دانوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔

جب مسلم یونیورسٹی کا سوال قوم کے سامنے آیا، تو بہت جلد یہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا، آزاد خیال لوگ جن کے قائد اعظم محمد علی (جناح نہیں جوہر) تھے، یہ چاہتے کہ مسلم یونیورسٹی کو اس کا حق ہو کہ وہ دوسرے اسلامی اسکولوں اور کالجوں کا الحاق کر سکے، حکومت یہ حق دینے پر تیار نہیں تھی لہٰذا بہت جلد ایک دوسرا گروہ ایسا پیدا ہوگیا، جو حکومت کے شرائط پر "بسر و چشم" یونیورسٹی قبول کرنے پر آمادہ تھا۔

اس تحریک کی ابتدا سے سر محمد شفیع نمایاں حصہ لے رہے تھے، یہ نمایاں حصہ کن کن حالات کا شکار ہوا، اسے محمد علی کی زبان سے سنئے:-

"مجھے اور (علی گڑھ) کالج کے ان طلبہ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شریک ہوگئے تھے، کالج سے اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن

لاج سے مجسٹریٹ ضلع کے صریحاً خلاف قاعدہ حکم کے ذریعہ مسلح پولس کی معرفت نکالدیا گیا، تو انہی سر محمد شفیع نے فوراً یونیورسٹی ایکٹ کا نفاذ کرادیا، اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے بہ حیثیت وائس چانسلر کے نوبت بجا کر یونیورسٹی کا افتتاح کرادیا۔

یہ وہی محمد شفیع تھے، جو سنہ ۱۲ء میں مارلین صاحب کی وزیر ہند کی طرف سے پیش کردہ شرائط قبول کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے، مگر بہ حیثیت وزیر تعلیم ہونے کے ڈاکٹر ضیاء الدین کے ایماء سے علی برادران کو قید خانۂ بیتول سے چھوٹنے پر بھی علی گڑھ نہ آنے دینے کی کوشش پر بھی آمادہ ہوگئے، اور جنہوں نے سنہ ۱۹۲۰ء کی ابتدا ہی میں سرہارکورٹ بٹلر سے ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور کو پیام بھجوایا کہ یا تو علی برادران کو علی گڑھ جانے سے روک دیا جائے، یا انہیں رام پور سے جلاوطن کردیا جائے،

چنانچہ ہم نے علی گڑھ کو تو نہ چھوڑا، البتہ رام پور اُس دن سے اب تک نہیں جاسکے ہیں!"

سی۔ آر۔ داس

ہندوؤں میں اب تک صحیح معنی میں غیر متعصب، روادار، اور

فراخ دل دو ہی لیڈر پیدا ہوئے ہیں، سری نواس آئنگر، اور سی۔ آر۔ داس

داس، کلکتہ کا سب سے بڑا بیرسٹر تھا، لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس تھی، ہندوؤں کا دوست، اور مسلمانوں کا سچا ہمدرد تھا، وہ واقعات پر واقعات کی حیثیت سے غور کرنے کا خوگر تھا۔

محمد علی اس کی وفات کے موقع پر اس کی کہانی سناتے ہیں:۔

"کلکتہ کے اسپیشل سشن میں داس نے مہاتما (گاندھی) جی کے نان کواپریشن (ترک موالات) کی مخالفت کی تھی (پھر) داس بنگال کی ایک بڑی جماعت کو لیکر سنہ ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتوں میں ناگپور آیا تو اس وقت بھی) وہ مہاتما جی کے نان کواپریشن کے موافق نہ تھا، بلکہ بابو بپن چندرپال ہی کا ہم رائے تھا۔

(ناگپور میں) کبھی کبھی موتی لال جی داس کے پاس ہوتے، اور نان کوآپریشن کی بحث (دونوں میں) اس شدومد سے ہوتی کہ ایک اجنبی کو (ان) دونوں ماہران قانون میں جنگ وجدل ہوجانے کا خطرہ محسوس ہونے لگتا، ایسے اوقات میں مجھے دونوں کی منت سماجت کرنا پڑتی۔

میرا تبلیغی مشن پنڈت جی کے طریقۂ استدلال و وکالت سے بالکل مختلف تھا، میں نے صرف ایک چیز پر زور دیا تھا، اور وہ یہ تھی کہ داس بیرسٹری چھوڑدیں، اور

لاکھوں کی سالانہ کمائی پر لات ماردیں۔

داس کے سب دوست اس معاملہ میں میرے خلاف تھے، وہ کہتے تھے کہ داس کی کمائی سے سیکڑوں محبانِ وطن فکرِ معاش سے سبکدوش ہو کر قومی کام کر رہے ہیں، داس نے اگر وکالت چھوڑ دی تو ان کا کیا حشر ہوگا؟

ایک شب رات کو تین بجے کے قریب جب میں مہاتما جی کے پاس سے داس کے پاس آیا، تو داس نے مجھے علیحدہ لیجا کر کہا کہ محمد علی تمہاری رائے ٹھیک تھی، میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بیرسٹری ترک کر دوں، البتہ چند مقدمات ہیں جو اس وقت دائر ہیں، اور جن کی میں پیروی کر رہا ہوں، اگر میرے مؤکل مجھے چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے تو ان کی پیروی کرنے پر میں مجبور ہوں، لیکن کوئی نیا مقدمہ نہ لوں گا، ایک مقدمہ ایسا ہے کہ میں مؤکل سے بھی درخواست نہیں کر سکتا کہ مجھے معذور رکھے۔"

وہ کلکتہ کا مشہور سامان جنگ کا مقدمہ تھا، جس میں افسر پولس نے حکام بالا سے پوچھے بغیر ہی داس کی قابلیت پر خاص اعتماد کرکے اسے (داس کو) دیا تھا، اور جس کے لئے بعد کو حکام سے بہت کچھ لڑنا جھگڑنا پڑا تھا۔

داس کلکتہ کے انگریزوں کا بالعموم، اور انگریز حکام کا بالخصوص

دشمن سمجھا جاتا تھا، لیکن اس خاص مقدمہ کو اس شد ومد کے ساتھ مستثنیٰ کرنے نے میرے دل پر تو ایک گہرا نقش بٹھا دیا کہ یہ شخص حق کی حمایت میں نہ دوست کا خیال رکھتا ہے نہ دشمن کا، اور اس کا دامن تعصبات سے پاک ہے۔

جس وقت داس نے مجھے یہ اپنا فیصلہ سنایا، میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مسرت ہوئی، اور مسرت کے ساتھ میرا دل کس قدر فخر کرنے لگا، کہ مجھ جیسا ادنیٰ شخص ایک اتنی بڑی قربانی کا محرک ہوا، میں اسی وقت داس سے لپٹ گیا اور اس کے گالوں کو بار بار بوسہ دیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ داس کی قربانی کتنی بڑی ہے، داس نے اپنی بیرسٹری کے آخری سال میں کم وبیش چھ لاکھ روپیہ کی آمدنی پر انکم ٹیکس دیا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ داس کے پاس کافی سرمایہ ہوگا، لیکن داس کی قربانی میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی، داس نے مجھے بتایا کہ میں ڈھائی لاکھ کا مقروض ہوں جس کو سنکر میرے ہوش اڑ گئے، اور دل ہی دل میں پچھتانے لگا کہ میں نے کیا غضب کیا؟ لیکن داس نے کہا کچھ پروا کی بات نہیں میرا مکان موجود ہے، اسے بیچ ڈالوں گا، تو قرضہ ادا ہو جائیگا

بنگال میں مسلمان اور ہندو تقریباً مساوی التعداد ہیں،

لیکن مسلمان اپنے افلاس اور جہالت کے سبب ایک ایسی قوم تھے، جن کا سیاسی پاس و لحاظ کرنا کسی ہندو لیڈر کے خیال میں بھی نہ آتا تھا، مجھے سارے ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا، جو بنگال کے مسلمانوں کا اتنا خیال رکھ سکتا تھا، جتنا داس نے رکھا، داس نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا، اسے کوئی شریف مسلمان نہیں بھول سکتا، لیکن مرنے سے پہلے داس نے انگریز قوم کو بھی صاف بتلا دیا کہ وہ کسی قوم و مذہب کے ساتھ نا انصافی کا روادار نہیں!"

(۱۸ جون ۱۹۲۵ء)

یہ دلآویز تصویر جو محمد علی نے کھینچی، حق یہ ہے کہ کسی دوسرے ہندو لیڈر سے مشابہت نہیں رکھتی۔

باب (۱۴)

کھری کھری باتیں

زندگی کے ہر دور میں، محمد علی کی صاف گوئی، ان کا طغرائے امتیاز بنی رہی، مداہنت، ان کے مذہب میں سب سے بڑا جرم تھا، حق بات کہنے سے، صاف صاف بات کرنے سے، کھری کھری سنانے سے وہ کبھی نہیں چوکتے تھے، خواہ کشورکشاؤں، اور فرماں رواؤں کا دربار ہو، یا ملک کے رہنماؤں اور سرداروں کا مجمع، دوستوں کی انجمن ہو، یا ارباب ہوا و ہوس کا عشرت کدہ، ان کی زبان کہیں نہیں رکتی تھی۔

وہ غور و فکر کے بعد اپنا ایک مسلک متعین کرتے تھے، اور شدت سے اس پر قائم رہتے تھے، بادِ مخالف کا کوئی جھونکا، مخالفت کا کوئی

طوفان، شورش اور ہنگامہ کا کوئی سیل بے پناہ، ان کے پائے ثبات میں لغزش، ان کے ارادہ میں تزلزل، اور ان کے فیصلہ میں تذبذب نہیں پیدا کر سکتا تھا، یہی مومن کی شان ہے، اور یہ بدرجۂ اتم ان میں موجود تھی۔

"پارٹی فیلنگ" یا جتھہ بندی کا ان کے ہاں نام و نشان بھی نہیں تھا، وہ جس جماعت میں بھی شریک ہوں، خرکائے جماعت کی غلطی اور غلط کاری پر نہ پردہ ڈالتے تھے، نہ اسے گوارا کرتے تھے، اسی شان جلال وجمال سے، جو اُن کا شیوۂ خاص تھی، وہ اپنوں کو بھی ٹوکتے، جھڑکتے، اور روکتے تھے، جس طرح غیروں اور بیگانوں کو، یہی وجہ تھی، کہ محمد علی اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قائم اور اٹل تھے، مگر ان کی جماعت بدلتی رہتی تھی، ان کے رفقاء کار میں انقلاب ہوتا رہتا تھا، ان کے ساتھیوں، اور دوستوں کی فہرست متغیر ہوتی رہتی تھی۔

ہمارے اکثر رہنما تک اس مرض میں گرفتار ہیں کہ دوسروں کی ہر غلطی، انہیں ہمالیہ سے بڑھ کر نظر آتی ہے، مگر "پارٹی" کے ممبر اگر ہمالیہ سے بھی بڑی غلطی کر بیٹھیں، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، توجیہ و تاویل ہر عیب کو صواب، ہر غلط کو صحیح، ہر زشت کو خوب بنا دے سکتی ہے، مگر محمد علی کا دامن اس آلودگی سے پاک تھا، ان کے نزدیک، خوب، خوب تھا، خواہ اس کا صدور دشمن ہی سے کیوں نہ ہو، زشت، زشت تھا خواہ اس کا ارتکاب دوست ہی سے کیوں نہ ہوا وہ کانگرس میں تھے

کانگرس کے صدر رہ چکے تھے، گاندھی جی کے دمساز اور مصاحب تھے، کانگرس کے رکن رکین تھے، مگر نہ گاندھی جی کی غلطی معاف کرتے تھے، نہ کانگرسیوں کی غلط روی پر پردہ ڈالتے تھے، وہ خلافتی تھے، مجلس خلافت کے بانیوں میں سے تھے، اس کے سب سے بڑے زعیم تھے، لیکن اگر کوئی لغزش خلافت والوں سے ہوجائے تو اسے بھی نہ بھولتے تھے، نہ معاف کرتے تھے، حق کی کوئی جماعت ہو ہی نہیں سکتی، اسی لئے زندگی بھر محمد علی ہجوم میں تنہا رہے!

وہ جب کھری کھری سناتے تھے، تو لب و لہجہ میں کبھی کبھی خشونت اور درشتی آجاتی تھی، الفاظ کی تلخی اور تیزی بڑھ جاتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ، ان کے انداز بیان کی شوخی، ان کے حسن بیان کی دلآویزی ان کی گل افشانی، گفتار کی گیرائی، برابر ان کے جلو میں رہتی تھی، اس لئے ان کا غصہ بھی پیارا معلوم ہوتا تھا، ان کی برہمی میں ایک ادائے دلفریب موجود رہتی تھی، ان کے تیکھے پن میں بھی ایک بانکپن نظر آتا تھا، یہ صرف محمد علی کی خصوصیت تھی۔

آیئے، ذرا اس معیار پر محمد علی کے جوہر کو پرکھیں۔

مہاسبھائی اور کانگرسی مہاسبھائی

محمد علی کی کوششوں سے دہلی میں ایک اسپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں مرحوم مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، اور

مولٰنا سید سلیمان ندوی صدر اجلاس۔

اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریسی ہندوؤں سے اپیل کی جائے کہ وہ مہاسبھائیوں کی اشتعال انگیزیوں اور فتنہ پرور مساعی کو روکیں، ورنہ پھر ہم بھی ان مسلمانوں کو نہیں روک سکتے جو ترکی بترکی جواب دینا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، وہ ایک مضمون لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کی (مہاسبھائیوں اور کانگریسی مہاسبھائیوں کی) یہ دلی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کے اس بہت ہی اہم مقولہ کو کہ "ہندو بزدل ہوتے ہیں اور مسلمان لڑاکا"۔۔۔ غلط ثابت کر دکھائیں۔

ان دونوں صورتوں میں سے ایک بھی (ایسی) نہیں ہے جسے صداقت کا حامل کہا جاسکے، بہر حال ہندو عوام الناس کو اس وقت متعصب ہندو لیڈر ان ترغیب دے رہے ہیں کہ ہندو جس قدر لڑاکا بن سکتے ہیں بنیں، اور کلکتہ میں جو کچھ زیادتیاں کی گئی ہیں انہیں اس قابل سمجھا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی جائے۔

خلافت (اسپیشل) کانفرنس کو مسلمانوں کو قابو میں رکھنا پڑیگا کہ وہ متعصب ہندوؤں کی نقل نہ کرنے لگیں، لیکن وہ مسلمانوں کو بزدل بنانے کی کوشش نہیں کر سکتی، اور اگر وہ ایسا

کرنا چاہے بھی تو اس میں کامیاب نہ ہوگی!"

(۲۹ اپریل سنہ ۱۹۲۶ء)

یہ اس محمد علی کی تحریر ہے، جو پکا کانگریسی ہے، جو ڈاکٹر کچلو اور حضرت خواجہ حسن نظامی کی تحریک تنظیم و تبلیغ کا سب سے بڑا مخالف ہے لیکن پھر بھی حق بات کہنے سے نہیں چوکتا۔ اور کانگریسیوں کو بھی اسی طرح ٹوکتا ہے جس طرح تنظیم اور تبلیغ کے رہنماؤں کو۔

"اصول سے اتفاق ہے!"

سیاسی دنیا میں ایک اصطلاح یہ چلی ہوئی ہے کہ اگر کوئی ایسی تجویز سامنے آئے، جس کے مسترد کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہو، لیکن جس کے منظور کرنے کا قطعاً ارادہ نہ ہو، تو "اصول سے اتفاق ہے!" کہکر ایسی باتیں شروع کردی جاتی ہیں کہ اصولی اتفاق بھی سنگین اختلاف بن جاتا ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۲۷ء میں جو تجویز "دہلی پروپوزل" کے نام سے منظور ہوئی تھی، اس میں مسلمان جداگانہ انتخاب ترک کرکے مخلوط انتخاب اس شرط پر قبول کرنے پر آمادہ تھے کہ ان کے دوسرے مطالبات بھی منظور کرلئے جائیں، یعنی ان کی اکثریت کہیں اقلیت نہ بنائی جائے، اور انکی اکثریت کے صوبوں کو اصلاحات عطا کی جائیں، مہاسبھائیوں، اور کانگریسی مہاسبھائیوں نے مخلوط انتخاب کے اصول سے اتفاق کرلیا لیکن

دوسری شرط ماننے سے انکار کردیا۔

ایک موقع پر مولانا حسرت موہانی نے بھی "اصول سے اتفاق ہے!" کہکر، باب مخالفت وا کرنا چاہا۔

محمد علی کہتے ہیں:-

"بظاہر اصول سے اتفاق کے وہ معنی بھی ہو سکتے ہیں، جو ہندو مہاسبھا والوں نے لئے تھے، کہ مخلوط انتخاب سے اتفاق ہے، اور صوبہ جات سرحد و بلوچستان کو اصلاحات دئے جانے اور بالخصوص سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کئے جانے سے اتفاق نہیں ہے!"

(یکم دسمبر ۱۹۲۷ء)

مذہب فراموش مذہبی دیوانے!

محمد علی کے زمانہ میں ایک اہم ترین مسئلہ باجہ اور گائے کا تھا، مسلمان اس پر راضی نہیں تھے، کہ ہندو مسجد کے سامنے باجہ بجاتے ہوئے گزریں، اور ہندو اس پر خون کی ندیاں بہا دینے کو تیار رہتے تھے، کہ مسلمان گائے ذبح نہ کریں۔

محمد علی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، اور سمجھداروں کو معاملہ فہمی کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"آج باجہ سے متعلق باجہ سے بھی بلند آواز ان مسلمانوں کی

ہوتی ہے، جو مشکل ہی سے کبھی نماز پڑھنے مسجد میں جاتے ہوں گے، اور گئو رکشا کے لئے بعض اوقات وہی آج سب سے زیادہ جوش کا اظہار کرتے ہیں، جو کل تک ہمارے ساتھ ولایت میں خوب "بیف" (گائے کا گوشت) اڑایا کرتے تھے!"

(۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء)

غلط رو ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس طرح ببانگ دہل وہی شخص ٹوک سکتا تھا، جو ہر دل عزیزی کی تمنا سے بے نیاز ہو، اور دونوں کو راہ راست پر گام فرسا دیکھنے کا متمنی ہو۔

اہم فیصلہ

کانگرسی ہونے کے باوجود، محمد علی غلط کار کانگرسیوں کو لتھاڑا کرتے تھے، بعض لوگ چاہتے تھے وہ کانگرس سے علیحدہ ہو جائیں، لیکن محمد علی اس نقطۂ نظر کے مخالف تھے، ان کا نقطہ یہ تھا:-

"ہم نے طے کرلیا ہے) کہ ہم خود کانگرس سے الگ نہ ہوں گے اور اگر کانگرس میں رہ کر مالوی جی، ڈاکٹر مونجے، مسٹر کیلکر اور مسٹر جیکر (وغیرہ) مسلمانوں کے خلاف اس قدر زہر اُگل سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کانگرس میں رہ کر ہم لوگ مسلمانوں کے حقوق کی واجبی نگہداشت بھی نہ کریں

اور ان کو بے سردار کی فوج کی طرح چھوڑ کر اوروں سے پٹوا دیں۔"

۱۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء

صلۂ وفا!

سائمن کمیشن جب ہندوستان میں آیا تو اس کی ہمہ گیر مخالفت احرار ہند کی طرف سے ہوئی، کانگرس نے بھی اس کا بائیکاٹ کیا، اور مجلس خلافت نے بھی، جو اس وقت مسلمانوں کی "واحد نمائندہ جماعت" کہلانے کی صحیح معنوں میں مستحق تھی۔

ہندوستان کا تو یہ حال تھا، لیکن پنجاب میں اس کی آؤ بھگت کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سر شفیع مرحوم سائمن صاحب کے لئے دیدہ دل فرش راہ کر رہے تھے۔

محمد علی نے اس موقع پر کہا:۔

"میں نے اہل پنجاب کی خدمت میں (تقریر کرتے ہوئے) عرض کیا تھا، کہ ان کی (پنجابیوں کی) وفاداری ان کے لئے کچھ زیادہ مفید نہ ثابت ہوگی، بلکہ اب تک مضر ہی ثابت ہوتی رہی ہے۔

مارلے منٹو اسکیم میں صرف وفادار پنجاب ہی وہ صوبہ تھا، جسے انتخاب کا حق نہیں دیا گیا تھا، بلکہ سر مائکل اوڈوائر ہی کو

حق نامزدگی مرحمت ہوا تھا، یہ سکھوں کی وفاداری ہی تو تھی، جس نے ان کو اس طرح مقید و محبوس کر رکھا تھا کہ ہندو اور مسلمان ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد رہے (آج تک حکومت نے مندروں یا مسجدوں پر کبھی قبضہ نہیں کیا تھا، یہ گردوارے ہی تھے، جن کی کنجیاں حکومت کے قبضہ میں تھیں۔

دفتروں کے بنگالی "بابو" ہمیشہ "باغی" رہے، لیکن انہی باغی بابوؤں میں سے لارڈ سنہا کو حکومت ہند میں شاہ ایڈورڈ ہفتم کے انکار کے باوجود رکنیت عطا ہوئی، جن کو کابینۂ وزارت (برطانیہ) کی رکنیت مرحمت ہوئی، پھر دار الامراء میں نشست نصیب ہوئی، اور نائب وزیر ہند کا منصب ملا، اور آخر کار وہ بہار میں گورنر کی گدی پر بٹھائے گئے، لیکن (پنجابی) فوج کے وفادار سورماؤں کو اب تک صوبیدار میجری اور رسالدار میجری سے کچھ زیادہ ملا تو جلیانوالا باغ!

یہ (انگریز) قوم اسی کی قدر کرتی ہے، جس کا یہ لوہا مانتی ہے، یہ ایک بہادر اور ہمت والی قوم ہے، اور بہادروں اور ہمت والوں ہی کو کچھ دے سکتی ہے، یہ اپنی آزادی قائم رکھنے اور دوسروں کی آزادی چھیننے کے لئے ہزاروں

قربانیاں کر چکی ہے، اور دوسروں سے بھی کرا چکی ہے، یہ اس کی وقعت کرے گی، جو اپنے ملک کی آزادی کے واسطے ہر قربانی کے لئے مستعد ہو، یہ ان دغا پیشہ لوگوں کو ہرگز کچھ نہ دے گی، جو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے سارے ملک کو بیچ ڈالنے کے لئے تیار ہیں!"

(۹ر فروری ۱۹۲۸ء)

ان حقائق کا جواب ہے کسی کے پاس؟

معرکتہ الآرا تقریر

۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں محمد علی نے ایک معرکتہ الآرا تقریر کی تھی، اس تقریر کا ایک حصہ درج ذیل ہے:-

"میں برک کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوں کہ تجاویز کی ضرورت نہیں آدمیوں کی ضرورت ہے، میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لئے کون سا دستور اساسی تیار کرتے ہیں؟ لیکن کاش آپ کے پاس ایک اصول بھی ایسا ہو جو درحقیقت انسان ہو، جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے کہ اے خدا! ایسا انسان دے، جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو، وہ ان بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو، جو ہمیشہ کے لئے گزر چکے ہیں، ایک شور و ہنگامہ سے لبریز سرزمین میں

ایک ایسے طاقتور آدمی کی ضرورت ہے، وہ خواہ امیر ہو، خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو، مگر اسے ایسا ہونا چاہئے کہ جو حکومت کر سکے، اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے۔

مجھے امید ہے، مسٹر میکڈانلڈ کم سے کم اپنے تئیں اس حکمران آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے، اور وہ اپنی جماعت، اپنے ضمیر، اپنی مُردہ بیوی کی روح، اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے۔

آج جس ایک مقصد کے لئے میں آیا ہوں، وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اس حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا، اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے، تو آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔

اُمید ہے ہم یہ تمام چیزیں لیکر واپس جائیں گے، اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صف میں واپس چلے جائیں گے، جہاں ہم دس سال پہلے موجود تھے، وہ آج ہمیں ملک کا غدار کہتے ہیں، اس دن آپ ہمیں باغی کہیں گے!"

حق کی آواز کتنی پرشکوہ ہوتی ہے؟ آج بھی فضا میں محمد علی کا نعرہ گونجتا ہوا معلوم ہوتا ہے!

ایک اہم خط!

علی گڑھ کالج سے محمد علی کی شیفتگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، وہاں ان عناصر کا غلبہ تھا، جو قوم کی آواز پر کان نہیں دھرتے تھے، مگر حکومت کے اشارہ چشم و ابرو کو سمجھنے کے فن میں کمال رکھتے تھے

نواب محسن الملک مرحوم اس زمانہ میں کالج کے سکریٹری تھے، ایک خط میں محمد علی لکھتے ہیں:۔

"مکروہات زندگی میں میرے خط کو بھی سمجھ لیجئے، اور جواب دیجئے، مگر جواب صاف اگو تلخ ہی کیوں نہ ہو، حال کے واقعات سنکر میں اپنے عزیزوں کی موت کو بھی بھول گیا، اور کالج و قوم کی وفات پر انا للہ پڑھ کر دو چار آنسو بہا لیتا ہوں۔ بہتر ہوکہ آپ اس مردہ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں، اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دے لیں، ساری عمر انہیں آرام نصیب نہیں ہوا ہے۔

لارڈ صاحب آئے، لارڈ کچنر گئے، امیر صاحب آئیں گے اور لارڈ منٹو تشریف لائیں گے، مارا چہ ازیں قصہ ...، نہ ان سے ہم کو فائدہ پہنچا ہے، نہ قوم کو، نہ آپ کو، مسلمانوں کو چند بڑی یا چھوٹی نوکریاں مل جائیں گی، آپ کو ایک فیل اور بے وقعت خطاب عطا ہوگا، مگر یورپین اسٹاف کا

نام بھی ہوگا، عزت بھی بڑھے گی، اور قوم کا روپیہ بھی، جسے آپ نے خون بہا کر پیدا کیا ہے، صرف ہوگا۔

آپ کو ایک دن سید احمد خاں سے ملنا ہے، ان کو کیا جواب دیجئے گا، "وجعلناک فی الارض خلیفا" کی یہی تفسیر ہے؟

(۲۶ نومبر ۱۹۰۶ء)

یہ مغالطہ نہ ہو کہ محمد علی، محسن الملک کے مخالف تھے، وہ محسن الملک کو اپنا بزرگ اور مخدوم سمجھتے تھے، ان کے اخلاص اور حب قوم کے قائل تھے لیکن وہ چونکہ یورپین اسٹاف سے کسی حد تک مرعوب رہتے تھے، اور محمد علی یورپین اسٹاف کا اثر و رسوخ کم کرنا چاہتے تھے، اس لئے، اپنے ایک بزرگ سے بھی وہ کھری باتیں کرنے میں نہ جھجک محسوس کرتے ہیں، نہ تکلف!

لاجواب خط!

مذکورہ بالا خط کے جواب میں نواب محسن الملک مرحوم نے اپنی کچھ معذوریاں تحریر کیں، اپنی بزرگی، اور ان کی خوردی یاد دلائی، اور ان کے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہا، مگر محمد علی، اصول کے معاملہ میں مروت کے قائل ہی نہیں تھے، اب کی انہوں نے ایک اور خط لکھا:۔

"مجھے سوا، آپ کے اوروں سے بھی انس و الفت ہے جن میں سے ہم پانچ بھائیوں کا سرتاج مگر میرے نزدیک میرا اکلوتا بھائی شوکت بھی ہے۔

اگر میں دیکھوں کہ شوکت کوئی ایسا کام کرتا ہے، جو میری قوم کے لئے مضر ہے، تو واللہ مجھے اس میں دریغ نہ ہوگا کہ دو چھریاں تیز کروں، ایک اس کے گلے پر دن کو، یا رات کو، چھپے چوری، یا علانیہ، زبردستی یا دھوکے سے پھیر دوں، (اور) پھر بہ تقاضائے محبت دوسری اپنے گلے پر بھی پھیر لوں۔

جب یہ میرے خیالات ہوں تو کیا آپ جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، مجھ کم عمر خادم قوم سے کہہ سکتے ہیں، کہ جائی تو قوم کو مارتا ہے مار، خود جواں مرگ مرتا ہے تو مر مگر میری بوڑھی ہڈیوں کو بچائے رکھنا، نواب صاحب! کیا ساری عمر آپ کا یہی شیوہ رہا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، کیا سید احمد خاں کا یہی اصول تھا؟ نہیں کبھی نہیں!

مجھے علم ہے آپ کی ساری عمر کی کوششیں تمغۂ قیصر ہند کی تمنا میں نہ تھیں، اب آپ منزل عمر کے اس حصہ پر آگئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر عالم جزا کی سیر، کر سکتے ہیں، وہ زمانہ کچھ ایسا دور نہیں ہے جب آپ اسی جگہ چلے جائیں گے جہاں نہ نائٹ ہڈ کی فکر ہے، نہ تمغوں کی تمنا، جہاں نہ آرزو ہے نہ خواہش، "ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" اور "رضوان اللہ" ہی سب سے بڑا۔

"آرزو" ہے، اور سب سے بڑا تمغہ!

(۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء)

یہ علی گڑھ کا گریجویٹ، آکسفرڈ کا سند یافتہ، انگریزی داں اور انگریز شناس محمد علی ہے، یا کسی مسجد کا ملا؟

یہ بڑودہ کے محکمۂ افیون کا افسر اعلیٰ ہے یا کسی منبر پہ کھڑے ہو کر وعظ کہنے والا واعظ آتش مقال؟

یہ کیسا شخص ہے جو سرتاپا انگریز بنا ہوا ہے، کھڑی مونچھیں، منڈی ڈاڑھی، انگریزی ٹوپی، کوٹ پتلون زیب بر، مگر جس کی زبان پہ "رضوان اللہ" ہے، "ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام" ہے!

یہ وہ محمد علی ہے، جس کے ظاہر میں تبدیلیاں ہوتی رہیں، مگر جس کا دل ہمیشہ مسلمان رہا، خدا اس سے راضی ہوا، اور وہ خدا سے راضی ہوا۔

باب (۱۵)

حقائق!

محمد علی کی زبان پر حقائق بھی آتے تھے، پراگندہ نقاب بھی، اور مکتوم و مستور بھی!

حقائق وہ کہ جنہیں تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ ہو! انداز بیان کی دل آویزی ایسی کہ سنتے جائیے، وقت گزرتا جائے، لیکن جی نہ بھرے، بیان و زبان کی شگفتگی و شیرینی، تلخ حقائق کو بھی، خوشگوار بنادیا کرتی تھی۔

والیان ریاست

محمد علی، بادشاہت کے شدید مخالف تھے، اس مسئلہ پر وہ کوئی سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتے تھے، اسی موضوع پر ایک مرتبہ اظہار خیال کرتے

ہوئے انھوں نے والیان ریاست کا ذکر کیا، پھر فرمایا۔

"جب تک بادشاہت قائم رہے گی، جب تک ملک، اور رعایا جاگیر کی طرح ترکہ میں ملتے رہیں گے تب تک امراض بھی باقی رہیں گے، بادشاہوں، راجاؤں، اور نوابوں کو معزول کردو، اور ان کی جگہ بہترین مولویوں، یا بہترین لیڈروں کو تختوں اور گدیوں پہ بٹھا دیکھو، دوسری نسل میں، تمام وہی امراض رونما ہوجائیں گے، کچھ کچھ تو اسی نسل میں (بھی) نظر آنے لگیں گے۔

انگلستان میں اس کا تجربہ کیا جاچکا ہے، لبرل پارٹی نے بارہا اپنی جماعت کے لوگوں اور اپنے ہم خیالوں کو دارالامرا کا رکن بنوایا اور اس ایوان میں جو غیر مساوی حالت کنسرویٹو پارٹی کی کثرت کے باعث تھی، اس کی اصلاح کی، لیکن دوسری ہی نسل میں وہی غیر مساوی حالت پھر نظر آنے لگی، اور لبرل لارڈوں کی اولاد کنسرویٹو خیالات رکھنے لگی۔ حقیقت یہ ہے، کہ انسان کو جس قسم کے ماحول میں رکھا جاتا ہے، اکثر وہ اسی کا بندہ ہوجاتا ہے، الا ماشاء اللہ!"

(۲۶ر فروری ۱۹۲۸ء)

برطانیہ پر الزام

گول میز کانفرنس (سنہ ۱۹۳۰ء) میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے کہا:۔

"برطانیہ کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ آج ہندوستان کی فوج اپنی نہیں ہے، آپ کا (انگریزوں کا) سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کو مردانہ اوصاف سے محروم کردیا۔

ہمارے پاس ۳۲ کروڑ آدمی ہیں، جب وہ قحط، اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو وہ یقیناً برطانوی گولی سے جان دینے کی توفیق بھی رکھتے ہیں!"

(دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء)

حریت خواہ ہندوستان

اپنی اسی گول میز کانفرنس کی تقریر میں محمد علی نے کہا:۔

"ہم میں ایک آزاد اور دردمند قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی آزادی کے لئے، مرنے کی خواہش ہونی چاہئے، اور یہ خواہش ہم میں بڑی تیزی سے پیدا ہو رہی ہے، جب یہ صورت ایک مصمم ارادہ کی صورت اختیار کرلے گی

تو آپ کیا کر سکیں گے؟ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا کہ آپ کو سارے انگلستان میں ایک سو بھی ایسے شقی القلب آدمی مل سکیں گے جوان نہتے اور غیر منشد د لوگوں پر فائر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر مرنے پر آمادہ ہیں، میں انگریز سپاہیوں کو ایسا بُرا نہیں سمجھتا!"

(دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء)

ہندو لیڈر

سوامی شردھانند کو جب ایک مسلمان نے قتل کیا، تو مسلمانوں نے من حیث القوم قاتل پر ملامت کی، سربرآوردہ مسلمانوں نے اس حادثہ سے اظہار برأت کیا، مسلمان رہنماؤں اور لیڈروں نے کھلے الفاظ میں اس فعل شنیع سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

لیکن سوامی جی کے قتل کے بعد، جب مسلمانوں کے قتل کا سلسلہ شروع ہوا، اور ناکردہ گناہ مسلمان بھی مارے جانے لگے، نہ ہندو قوم نے ان حوادث پر پشیمانی اور رنج کا اظہار کیا نہ ہندو رہنماؤں نے ان واقعات سے اظہار برأت کیا، کانگرسی لیڈروں، موتی لال نہرو، اور گاندھی جی تک نے سکوت کو گفتگو سے زیادہ معنی خیز سمجھا۔

محمد علی نے سوامی جی کے قتل پر اظہار افسوس علانیہ کیا تھا، وہ چاہتے

تھے، ہندو بھی ایسا ہی کریں، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔

انہوں نے "ہمدرد" میں ایک مقالہ لکھا، فرمایا:۔

"دہلی کے چند مسلمان جذبۂ انتقام کے شکار ہوئے ہیں، اس (حادثہ) پر جن ہندو لیڈروں اور ہندو اخباروں نے اظہار افسوس وندامت، نفرت و برأت کیا ہو، وہ براہ کرم اس سے مجھے مطلع فرمائیں، میں اسے مسلمانوں کی اصلاح اور تسلی کے لئے ضرور شائع کروں گا۔

مسلمانوں سے ایسی (قاتلانہ) حرکات پر اظہار بیزاری و برأت کے لئے، کوئی ہندو نہیں جو پیچھے رہا ہو، مگر کتنے ہندو لیڈر اور ہندو اخبارات ہیں جنہوں نے کٹارپور کی ظالمانہ اور وحشیانہ حرکات پر، آرہ، شاہ پور، گیا، اور پٹنہ کی سازش پر اظہار ندامت کیا ہو؟

مسلمانوں نے جن پر مہاتما جی کو اعتراض ہے کہ "اس میں شک نہیں (مسلمان) چھری اور پستول کے استعمال میں بہت بیباک اور آزاد ہیں"۔ بہار اور کٹارپور کے مظالم پر کون سی خون کی ندیاں بہا دی گئی تھیں؟

ہم دونوں بھائیوں نے تو کٹارپور کے وحشی قاتلوں تک کو معاف کر دیے جانے کے متعلق وزیر ہند کو تار بھیجا تھا"۔

(۷ر جنوری ۱۹۲۷ء)

یہ الفاظ محمد علی کے قلم سے اس وقت اور اس زمانہ میں نکلے ہیں، جب وہ خالص کانگرسی تھے، اور مسلمانوں سے "ہندو پرستی" کے الزام میں گالیاں کھا رہے تھے، اُس زمانہ میں بھی حق بات کہنے سے وہ کبھی نہیں چُوکے، اظہار حقائق سے وہ کبھی نہیں باز آئے!

دہلی پروپوزل!

مارچ ۲۷ء میں جو متفقہ فیصلہ کیا گیا تھا، اور جو "تجاویز دہلی" یا "دہلی پروپوزل" کے نام سے مشہور تھا، اس کی تغیر و ترکیب میں محمد علی کا بہت بڑا حصہ تھا، وہ چاہتے تھے، مسلمان اس کے نکات سمجھ لیں، ہندو اس کی خوبیوں سے واقف ہو جائیں، مسلم لیگ انہیں اپنا لے، اور کانگرس ان پر مہر تصدیق ثبت کر دے۔

اس میں کوئی شک نہیں ۱۹۲۷ء تک مسلمانانِ ہند کو جو شکایات تھیں، اور ہندوؤں کو جو شکوے تھے، اور سیاسیات ہند میں جن مسائل نے بحرانی کیفیت پیدا کرائی، ان کا بہترین علاج "تجاویز دہلی" میں کامل غور و فکر کے بعد، ملت کے طبیبوں نے تجویز کیا تھا۔

اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں:۔

"یہ (تجاویز دہلی) خلافت اور کانگرس والوں کی ایجاد کردہ نہیں ہیں کہ مسلم لیگ والوں پر ان کی مخالفت فرض ہو، یہ صوبجات متحدہ کی بھی ایجاد نہیں ہیں کہ پنجاب والوں پر

ان کی موافقت حرام ہو، ان کے تین اجزا ہیں:-
ایک یہ کہ ہر ملت کے مذہبی فرائض کی ادائگی اور اس کی مذہبی آزادی، اور اس کے مذہبی حقوق، عام اتفاق سے نہ کہ صرف ایک ملت کی کثرتِ رائے سے طے کرا کے محفوظ کرادئے جائیں، اور کوئی قانون ساز مجلس ایک ملت کی کثرتِ رائے سے نہ ان کو منسوخ کرسکے، نہ ان میں ترمیم کرسکے۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ سب امور ایک ملت کی کثرت رائے سے طے نہ پایا کریں، اگر ایک اقلیت کی بڑی اکثریت بھی کسی مسودۂ قانون یا تحریک کے خلاف ہو، اور ظاہر کرے، کہ اس کی ملت کا اس سے نقصان ہوگا، تو وہ اکثریت حاصل ہونے کے بعد بھی منظور نہ ہوسکے۔

تیسرا اور آخری جزو یہ ہے کہ اگر ہندو چاہتے ہیں کہ ہماری چھوٹی سی اقلیت چند بڑے بڑے صوبوں میں انکی بڑی اکثریت کے رحم پر چھوڑ دی جائے تو وہ بھی اس پر راضی ہوجائیں کہ دو بڑے بڑے صوبوں میں ان کی بڑی اقلیت بھی ہماری چھوٹی سی اکثریت کے اور تین چھوٹے چھوٹے سے صوبوں میں ان کی چھوٹی سی اقلیت ہماری بڑی اکثریت کے رحم وکرم پہ چھوڑ دی جائے۔

اگر ان کی اکثریت ہماری اقلیت کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کرے گی، تو ہماری اکثریت بھی ان کی اقلیت کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرے گی، یعنی "جو تم ہم سے سیدہم سادہم سودہم تو ہم بھی تم سے سیدہم سادہم سودہم اور جو تم ہم سے ٹھینگڑ ٹانگڑ ٹونگڑ، تو ہم بھی تم سے ٹھینگڑ ٹانگڑ ٹونگڑ!"

(۱۸ اپریل ۱۹۲۷ء)

ایک اہم ترین سیاسی مسئلہ کو محمد علی نے کس وضاحت سے، کس عام فہم طریقہ سے، کس خوبی سے بیان کردیا کیا یہ محمد علی کا کمال نہیں تھا؟

توہینِ عدالت

۱۹۲۱ء میں محمد علی پر جب کراچی میں مقدمۂ بغاوت چلایا گیا، تو محمد علی کے طرزِ عمل کو "توہینِ عدالت" سے بھی تعبیر کیا گیا تھا۔

گاندھی جی کو کراچی جیل سے محمد علی نے ایک طویل خط لکھا تھا جس کا ایک اہم حصہ درج ذیل ہے:-

میں ان چند واقعات کا بھی اس موقع پر تذکرہ کردینا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے میں عدالت کی توہین کرنی پڑی، ہمارا حقیقی مقصد شرارت نہ تھا، عدالت میں تین روز تک کارروائی عمدگی سے ہوتی رہی جس طرح کہ وکیل استغاثہ صفائی کا الزام دے سکتا ہے اس سے زیادہ عدالت اس توہین کا ملزم نہیں قرار دے سکتی مولانا حسین احمد صاحب کے بیان سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے، عدالت نے

انکار کیا کہ وہ کسی قابل مترجم کو بلائے یہی وجہ تھی کہ کچلو نے بھی اصرار کے ساتھ
اردو ہی میں جواب دیا، کیونکہ مجسٹریٹ نے ایسے ملزم کا بیان قلمبند کرنا چاہا
جس کو مترجم کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے بعد تو زمین و آسمان بالکل بدل
گیا۔ اگرچہ ہمیں خود علم نہیں کہ یہ تبدیلی رات میں کیوں ہو گئی، خود عدالت ہی
نے توہین کی، کچلو کا بیان جو میرے بیان کی طرح تھا، اس کے پہلے جملہ پر
اعتراض کیا گیا اور مجسٹریٹ نے اسے قلم بند نہ کیا، اس کے بعد شنکر اچاریہ سے
اصرار کیا گیا کہ وہ بیان دینا چاہتے ہیں تو کھڑے ہوں۔

شنکر اچاریہ نے کہا کہ مذہب کی وجہ سے میں ایسا نہیں کر سکتا اور جو
سے میرے اور مجسٹریٹ کے درمیان بات نے طول پکڑا، اس ردوقدح
میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ آیا وہ شنکر اچاریہ جیسے
مقدس مذہبی حیثیت والے شخص سے اصرار کرتا ہی رہے گا کہ وہ قانونی
عدالت کے اصول کا احترام کریں۔ حالانکہ میں خود اب جس چیز کو وہ مقدس
سمجھتا رہا ہے، اس کی تذلیل کر رہا ہوں، جب وہ قانونی عدالت کا
اس قدر احترام کرتا ہے تو کیا خدا پر ایمان نہیں ہے؟

جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا ہے، وہ صرف استفہام کا حصہ ہے
کیا خدا پر تمہارا ایمان نہیں ہے؟ میری اس اپیل کا جو اس نے جواب دیا
وہ ایک نہایت ہی خراب لہجے میں حکم تھا کہ میں بیٹھ جاؤں، لیکن جب
میں نے اس حکم سے انکار کیا تو میں نے ہرگز کہا نہیں تھا "مجھے دیکھنا ہے تم
کیا کرو گے؟" میں نے یہ کہا تھا کہ تم طاقت استعمال کر سکتے ہو لیکن ایسا

کوئی قانون نہیں ہے جس کے ماتحت کوئی ملزم بیٹھ جانے کے لئے مجبور
کیا جا سکے۔

بیچارے شوکت نے تو مجسٹریٹ کو ملائم کرنے کی انتہائی کوشش کی
اور یہ درخواست بھی کی کہ میرے دوران بیان میں مداخلت نہ کی جائے،
لیکن مجسٹریٹ نے صاف طور پر ارادہ کر لیا تھا کہ گزشتہ روز میں نے جو
بیان دیا تھا اس کی طرح اب کوئی اور ایسی بات نہ ہو گی۔

جب مولانا حسین احمد نے اپنا بیان دینا شروع کیا تو نہ عدالت کے
مترجم نے اس کا ترجمہ کیا (کیونکہ وہ اپنی ناقابلیت کا اعتراف کر چکا
تھا کہ وہ قانون اسلام کی تفسیر کا ترجمہ نہیں کر سکتا) اور نہ اس امر کی
کوشش کی گئی کہ جو کچھ مولانا صاحب فرما رہے ہیں، اس کو سمجھا جائے
اس کی مجسٹریٹ کی لاپرواہی گستاخی تھی، لیکن پھر بھی اس نے ایک
دو مرتبہ براہ راست توہین کی، مثلاً یہ کہ ضروری ہے، کہ تمام قرآن
یہاں پڑھ دیا جائے، مولانا نثار احمد صاحب کے بے حد مختصر بیان کا
بھی اچھا حشر نہ ہوا۔

قانونی کارروائی کے متعلق بھی مجسٹریٹ اس قدر بے پروا تھا کہ
میرے باقی ماندہ بیان سے قبل ہی اس نے ہم کو سیشن سپرد کر دیا۔

یہ کیسا تعجب خیز امر ہے کہ ایک مجسٹریٹ کارروائی سے قبل ہی نتیجہ
نکال لے، اور قبل اس کے کہ تفتیش ختم ہو، خود جوڈیشل کمشنر کمرہ
دیکھنے کے لئے، سیشن کی کارروائی کے واسطے دیکھنے کے لئے، تشریف

لاتے ہیں، اور وکیل استغاثہ سے اس امر میں گفت و شنید کرتے ہیں، میں نے عدالت سے کہا کہ آپ نے ڈپٹیوں کو بھی اسی طرح (پھانسی کے) تختے تیار کرنے کا حکم دیدیا ہوگا۔

جب کبھی اسلامی قانون کا حوالہ دیا جاتا تھا تو یہ بات مجسٹریٹ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی، اور وہ کہدیتا تھا کہ یہاں ہمیں فتووں سے بحث نہیں ہے۔

شوکت نے اس سے کہا کہ تم جو مجھ سے یہ حقیر سی باتیں دریافت کرتے ہو، اس سے فائدہ کیا ہے، مجھ سے تو یہ پوچھو کہ ایسے واقعات کے متعلق اسلامی قانون کیا کہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے مجسٹریٹ کو ہمیشہ اضطراری حرکتیں کرنے والا آدمی پایا۔

ہم اپنے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ تو عدالت سے مقابلہ کرنا تھا، اور نہ شرارت، اس کے ساتھ ہی ہم حیوانوں کی طرح گونگے بھی بننا نہیں چاہتے، اور عدم تشدد کا مفہوم جہالت کبھی بھی نہیں تھا۔ تشدد ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے اور ہر مسلمان فیصلہ کے دن آنکھیں کھول لے گا کہ جبکہ تشدد کے صحیح حدود خود اس کے اپنے ذاتی مقدمہ میں قائم ہوں گے، لیکن عدم تشدد کی ذمہ داری اس سے بھی زیادہ ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کے مریدان کے اطاعت شعار غلاموں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں، جو بزدلی کی حدود میں آتا ہے۔!"

(۱۸، اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء)

تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں محمد علی کے یہ خیالات کتنے آزاد اور بیباکانہ ہیں؟ اور یاد رہے کہ یہ اس زمانہ کے ہیں جب محمد علی شوکت علی ملنگ نکبری کی طرح گاندھی جی کے ہم رکاب رہتے تھے۔

دوستی کی ریاضی

پیر محفوظ علی بدایونی کو ایک مکتوب میں محمد علی لکھتے ہیں:۔

"دوستی کی ریاضی بھی عجیب ہے، خوشی کو دوگنا، اور رنج کو آدھا کر دیتی ہے!"

(۲۷۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء)

نواب جاورہ کے نام!

گزشتہ جنگ عظیم میں ایک موقع پر نواب صاحب جاورہ نے ترکوں کو احمق، جرمنوں کو ظالم، اور انگریزوں کو برتر فرما کر مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ ترکوں کو سزا دینے کی ایک بہترین صورت یہ ہے، کہ مسلمانان ہند اس سال حج کو نہ جائیں۔

محمد علی اس زمانہ میں لینسڈون جیل میں تھے، نواب صاحب کا یہ مشورہ دیکھ کر ان سے ضبط نہ ہو سکا، انھوں نے ایک بہت طویل خط نواب صاحب کو لکھا، جو سارا کا سارا اس قابل ہے کہ پڑھا جائے، اور سمجھا جائے۔

اس کا ایک اہم حصہ جو "حقائق" سے تعلق رکھتا ہے، درج

ذیل ہے :۔

عزم سفر مغرب و ورود در مشرق
اے راہبر پشت بہ منزل ہشدار

یہ اس رُباعی کا ایک شعر ہے جو شاہ جہاں نے مثمن برج (قلعۂ معلی) پر کندہ کرائی تھی تاکہ دُنیاوی دلچسپیاں دینی فرائض سے اندھا نہ کردیں۔

کاش مغلوں نے ہمیشہ اس رُباعی کو پیش نظر رکھا ہوتا اگر ایسا کیا ہوتا تو آج ان کی اولاد دروَر گداز نہ ہوتی، جاورہ کی فرمانروائی ایک مقتدر چیز ہے، اگر جس ہدایت کو بھول کر مغلوں نے سلطنت کھوئی اس کو جاورہ کا رئیس بھلائے گا تو کیا نتیجہ ہوگا؟"

(۷ر جولائی ۱۹۱۵ء)

یہ نہیں معلوم نواب صاحب جاورہ نے اس تاریخی مکتوب کو پڑھا یا نہیں؟ اور اگر پڑھا تو اس سے سبق کیا لیا۔ لیکن محمد علی کی یہ حقائق آفرینی صفحۂ تاریخ پر باقی رہ گئی۔

غلامی سے بیزاری

سنہ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس لندن میں جاتے ہوئے محمد علی کہتے ہیں :۔
"خدا کرے ہمارے بھائی ذہنیت سمندر پار جاکر بدل جائے۔
اور ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا احساس ہو۔

خدا ہندو مسلمان دونوں کو توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں، اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش نہ کریں!"

اگر ان حقائق پر، ہندو زعماء نے غور کیا ہوتا، اور غلامی سے اتنے بیزار ہوگئے ہوتے کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہوتے، نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کرتے، تو آج ہندوستان کی حالت کچھ اور ہوتی!

ویوز پیپر

ہندوستانی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر محمد علی نے کہا :۔
"یہ (اخبارات) نیوز پیپر (NEWSPAPER) (یعنی خبریں دینے والے) ہرگز نہیں ہوتے، حقیقتاً (WIEWSPAPER) ویوز پیپر (خبروں پر رائے کا رنگ چڑھا دینے والے اخبار) ہوتے ہیں، اور جو خبریں (نیوز) ان اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، وہ دراصل اڈیٹروں کی ویوز (آراء) ہوتی ہیں!"
کون کہہ سکتا ہے یہ "برحق" نکتہ چینی آج بھی غلط ہے؟

ایک تصویر

پیر محفوظ علی صاحب بدایونی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔
"بڑے بڑے ماہر اور مبصر اُن کے (محمد علی کے) مذاق کی صحت کے

خدا ہندو مسلمان دونوں کو توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں، اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش نہ کریں!"

اگر ان حقائق پر ہندو زعمانے غور کیا ہوتا، اور غلامی سے اتنے بیزار ہوگئے ہوتے کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہوتے، نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کرتے، تو آج ہندوستان کی حالت کچھ اور ہوتی!

ویوز پیپر

ہندوستانی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر محمد علی نے کہا:۔

"یہ (اخبارات) نیوز پیپر (NEWSPAPER) (یعنی خبریں دینے والے) ہرگز نہیں ہوتے حقیقتاً (WIEWSPAPER) ویوز پیپر (خبروں پر رائے کا رنگ چڑھا دینے والے اخبار) ہوتے ہیں، اور جو خبریں (نیوز) ان اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، وہ دراصل اڈیٹروں کی ویوز (آراء) ہوتی ہیں!"

کون کہہ سکتا ہے یہ مبرحق "نکتہ چینی" آج بھی غلط ہے؟

ایک تصویر

پیر محفوظ علی صاحب بدایونی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بڑے بڑے ماہر اور مبصر ان کے (محمد علی کے) مذاق کی صحت کے

قائل تھے، دلی کے ایک شہزادے روغنی تصویر بناتے تھے، غالباً بیچارے کی معاش کا ذریعہ یہی تھا۔

محمد علی کو انھوں نے دلی کی جامع مسجد کی تصویر پیش کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چونکہ گداگروں کی موجودگی بھی ایک لازمی بات ہے لہذا مصور نے بھی نقل کو اصل کر دکھانے کی غرض سے ایک سیڑھی پر ایک عورت کی تصویر بنائی، جو ایک پھٹا پرانا برقع اوڑھے، دو ننگے بچوں کی انگلی پکڑے کھڑی تھی، نیچے لکھا تھا، "جامع مسجد دہلی"!

محمد علی نے تصویر دیکھ کر کہا میں تصویر لینے اور ہدیہ دینے کو اپنی طرف سے حاضر ہوں، بشرطیکہ الفاظ "جامع مسجد دہلی" کے بجائے جو فقرہ میں عرض کروں اسے درج فرمادیں، شہزادہ صاحب نے منظور کیا، محمد علی نے پنسل سے ایک کاغذ پر لکھ دیا:۔

HERFATHERBUILTIT

(اس بھکارن کے اجداد کی بنائی ہوئی عمارت)

اب وہ جامع مسجد کے معمولی نقشہ کے بجائے آل تیمور کا ایک مرقع عبرت ہوگئی، محمد علی کے ڈرائنگ روم میں جو صاحب نظر اسے دیکھتا تھا، ممکن نہ تھا کہ ایک گرم آنسو یا ایک ٹھنڈی سانس اسے بطور خراج نہ پیش کرتا!"

(۱۰ ستمبر ۱۹۲۳ء)